(افسانے)
خزاں کا گیت
http://www.pakistanconnections.com/ebooks
اے حمید

(افسانے)

شاہدرے کی ایک شام

بھاٹی دروازے کے باہر میں شاہدرہ جانے والی بس کا انتظار کر رہا تھا۔

رسالہ ''آثار قدیمہ'' کے ایڈیٹر کا خرید کر دیا ہوا بلیک اینڈ وائٹ سگریٹوں کا ڈبہ میرے لمبے کوٹ کی جیب میں تھا اور ایک سگریٹ میرے داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ میں شاہدرے مچھلیاں پکڑنے یا مقبرے کی دیواروں پر اپنا نام لکھنے نہیں بلکہ نور جہان پر ایک افسانہ لکھنے جا رہا تھا جسے ''آثار قدیمہ'' کے پہلے شمارہ میں چھپنا تھا۔ ایڈیٹر نے سگرٹوں کا ڈبہ تھماتے ہوئے تاکید کی تھی کہ افسانہ کافی سنسنی خیز ہونا چاہیے اور میرے اندر سنسنی دوڑ گئی تھی۔

بس کا دور دور تک نشان نہ تھا اور قریب قریب بھی لوگ انتظار سے تنگ آ چکے تھے۔ چند ایک دیہاتی عورتیں زمین پر بیٹھ گئی تھیں اور پوٹلی میں سے گڑ اور روٹی نکال کر وہیں کھانے لگی تھیں۔ بھرپور جاڑے کا یہ بڑا ہی چمکیلا دن تھا۔ دھوپ ڈھل رہی تھی اور اس کی نارنجی چمک میں بازار میں ہر شے نکھر رہی تھی۔ چوک میں لوگوں کا ہجوم تھا اور ان کے چہرے دھوپ میں روغنی معلوم ہو رہے تھے عجیب عجیب چہرے' میلے میلے اور صاف صاف کپڑوں والے لوگ' تانگوں' سائیکلوں' موٹروں اور چھکڑوں سے بچتے بچاتے منہ اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ سامنے والے سینما گھر کے باہر کافی بھیڑ تھی۔ اور کیوں نہ ہو ماسٹر بھگوان کا تیار کردہ لڑائی مار کٹائی سے بھرپور فلم ''جادو رتن عرف بھوتنی کا'' چل رہا تھا۔ کوچوان تانگوں میں گلہ پھاڑ پھاڑ کر موری دروازے' شاہ عالمی دروازے اور موچی دروازے جانے والی سواریوں کو پکار رہے تھے۔ سپاہی انہیں ایک جگہ رکنے نہ دیتا تھا۔ مگر وہ بھی ہٹ کے پکے تھے۔ چوک کا پورا چکر کاٹتے اور پھر اسی جگہ آن کھڑے ہوتے۔ عورتیں' بوڑھی عورتیں' ادھیڑ عمر کی عورتیں' نوجوان لڑکیاں' کوئی کھلے منہ' کوئی خالی گرم شال لیے اور کوئی برقع اوڑھے بھاٹی دروازے میں داخل ہو رہی تھیں اور باہر نکل رہی تھیں۔ اچانک میری نظر ایک لڑکی پر پڑی جو سیاہ برقع اوڑھے ناپ تول کر قدم اٹھاتی دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ چال میری جانی پہچانی ہو جیسے اس لڑکی کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔ دبلے پتلے جسم والی وہ لڑکی اب سڑک سے ہٹ کر ٹکسالی دروازہ کو جانے والے باغ میں ہو لی تھی۔ گھاس کے ہریالے خطوں کے درمیان سرخ روش پر اس کے چھوٹے چھوٹے قدم بڑے ربط اور سلیقے سے اٹھ رہے تھے اور سفید سینڈل پر

مرغابیوں کا گمان ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ فہمیدہ یاد آ گئی۔ وہ بھی سفید سینڈل بڑے شوق سے پہنتی ہے اور ان کا گھر بھی بھاٹی دروازے کے اندر ہے۔ وہ بھی ہلکے نیلے رنگ کا ریشمی برقع اوڑھتی ہے۔ دبلے پتلے سپید جسم کی فہمیدہ۔ اس لڑکی کی چال فہمیدہ سے کتنی ملتی جلتی تھی۔ کہیں یہ فہمیدہ ہی نہ ہو! میں نے سگریٹ پھینکتے ہوئے باغ میں نگاہ دوڑائی۔ روش پر سفیدے اور کروٹین کے درختوں کا سایہ تھا اور اس لڑکی کا برقع ہلکی سرد ہوا میں لہرا رہا تھا اور وہ چپ چاپ چلی جا رہی تھی۔ کہیں یہ فہمیدہ ہی نہ ہو؟ میں سوچ رہا تھا اور وہ لڑکی میری نگاہوں سے دور ہوئی جا رہی تھی۔ وقت اور زندگی کا ریلا اسے مجھ سے دور۔ اور دور لیے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا دبلا پتلا جسم کارپوریشن کی گندگی اٹھانے والی موٹر کے عقب میں چھپ گیا اور شاہدرہ جانے والی بس چپکے سے میرے بالکل قریب آن کھڑی ہوئی۔

''عورتیں پہلے' عورتیں پہلے سائبان''

بس کنڈکٹر چیختا رہا مگر نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ طوطی چلاتی رہی اور سائبان سب سے پہلے سوار ہوئے اور عورتیں سب سے آخر میں۔ عورتیں ہر جگہ پیچھے رہتی ہیں۔ میدان جنگ میں مردوں کی مرہم پٹی کرتے ہوئے' انارکلی میں مردوں کے ساتھ چلتے ہوئے اور ڈولی میں بیٹھ کر سسرال جاتے ہوئے۔ انہیں بسوں میں بھی سب سے آخر میں سوار ہونا چاہیے۔

گھرر گھرر جیسے موٹر کے انجن نے میری تائید کی اور بس چل پڑی۔

ٹکسالی دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے باغ میں اس لڑکی کو دور دور تک دیکھا مگر اس کا کہیں نشان نہ ملا۔ وہ کہیں گم ہو چکی تھی۔ یہ خیال کہ وہ لڑکی فہمیدہ ہی تھی میرے ذہن میں اپنے پاؤں جما رہا تھا اور جب میں شاہدرہ موڑ پر اتر کر نور جہاں کے مقبرے کی طرف روانہ ہوا تو مجھے پورا یقین ہو چکا تھا کہ وہ لڑکی فہمیدہ ہی تھی۔

نور جہاں کا مقبرہ اجاڑ اور مرجھائے ہوئے درختوں کے درمیان کسی پرانے اور زنگ آلودہ بجورے کی طرح پڑا تھا۔ دیواروں کا سیمنٹ اور چونا اکھڑ چکا تھا اور محرابوں پر گلے سڑے پتوں والی بیلوں کی مردہ شاخیں ہوا میں مل رہی تھیں۔ مقبرے کے اندر سردی اور تاریکی تھی۔ قبروں کے تعویذ منجمد فریادیں تھیں اور ان لوگوں کی یاد دلا رہے تھے جنہیں وطن سے ہزاروں میل دور کسی ویرانے میں موت نے آن لیا ہو۔ دیواروں پر بڑے بڑے دردناک شعر لکھے تھے۔ میں نے بھی کوئلے سے ایک سوگوار شعر لکھا اور سگریٹ سلگا کر مقبرہ جہانگیر کی طرف چل پڑا۔ ریلوے لائن عبور کرتے ہی مجھے شاہدرہ چار دیواری کے اندر کھجور' یوکلپٹس اور جامن کے درخت نظر آئے جن کی پھنگیں دھوپ کی مدھم ہوتی کرنوں میں ایک خیال سا معلوم ہو رہی تھیں۔ اور جن کے عقب میں سردیوں کی شام کا

آسمان نکھر کر گہرا نیلا اور بے حد وسیع ہو گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا کسی نے میرے ہاتھ سے تارا مارکہ بیڑی لے کر مجھے بلیک اینڈ وائٹ کا سگریٹ تھما دیا ہو۔ بلیک اینڈ وائٹ مجھے رسالہ ”آثار قدیمہ“ کے ایڈیٹر کا خیال آ گیا۔

افسانہ سنسنی خیز ہو

اور میرے جسم میں ایک بار پھر سنسنی دوڑ گئی۔

اگر پکنک یا کسی خوبصورت لڑکی کے ساتھ سیر کا لطف اٹھانا ہو تو مقبرہ جہانگیر سے بڑھ کر لاہور بھر میں کوئی جگہ اتنی موزوں نہیں۔ لارنس باغ یا شملہ پہاڑی تو کرکٹ میچ دیکھنے یا ٹانگیں تڑوانے کے لیے ہیں۔ لارنس باغ میں سیر کرتے ہوئے آپ کو گھاس کے ہرے بھرے قطعے ضرور ملیں گے مگر ساتھ ہی ہر قطعہ کے باہر گھاس سے بچ کر چلیں، کے بورڈ بھی نظر آئیں گے اور آپ کو محسوس ہو گا آپ اسلحہ تیار کرنے والے کارخانے میں گھوم رہے ہیں جہاں ذرا سی بے احتیاطی کا نتیجہ ایک آدھ دھماکہ اور پھر موت ہے۔ لیکن مقبرہ جہانگیر کی چار دیواری کے اندر صاف ستھری چمکیلی روشیں ہیں جن کے بیچوں بیچ چھوٹے چھوٹے خوبصورت فواروں کی قطاریں ہیں اور جہاں دو رویہ سرو کے سرسبز درخت کھڑے ہیں۔ جہاں ترشی ہوئی گھاس کے نرم نرم خطوں میں اگے ہوئے سایہ دار درختوں میں رنگین پرندوں کے گھونسلے ہیں۔ مقبرہ کے نیم تاریک سنگین اور ٹھنڈی غلام گردشوں کی فضا میں دھیمی دھیمی رومانوی کیفیت رچی رہتی ہے۔ وہاں کئی ایسے مقام ہیں جہاں پہنچ کر آپ اپنی ساتھی لڑکی سے بلا جھجک اظہار عشق کر سکتے ہیں۔ اور اس لڑکی کا مزاج سرد تر ہو تو آپ اس کے ہونٹ بھی چوم سکتے ہیں۔ آپ کو کوئی نہ دیکھ سکے گا۔ لارنس اور شملہ پہاڑی میں یہ بات کہاں شملہ پہاڑی کے پاس ہی ریڈیو سٹیشن ہے۔ وہاں نہ صرف آپ کو دیکھا جا سکتا ہے بلکہ شہر بھر میں نشر بھی کیا جا سکتا ہے اور لارنس میں آپ کو سائیکل بھی باہر ہی چھوڑنا پڑتی ہے اور ہو سکتا ہے کچھ عرصہ بعد آپ کو جوتے بھی باہر اتارنے پڑیں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ایک وقت آئے جب سائیکلوں کے ساتھ عورتوں کو بھی سٹینڈ پر تالا لگا کر چھوڑنا پڑے Lock Your Cycles کے ساتھ ساتھ Lock Your Women کا بورڈ بھی دکھائی دینے لگے۔

کہاں لارنس باغ اور کہاں شاہدرہ باغ!

کہاں راجہ بھوج اور کہاں۔ مگر یہ گنگو تیلی کی کہانی نہیں ہے۔ یہ اصل میں راجہ بھوج کے باغ ہی کی داستان ہے۔ شاہدرہ باغ جہانگیر کے لیے بنوایا گیا تھا اور میں اس باغ میں ایک حوض کے کنارے کھڑا تھا۔ حوض میں پانی کا رنگ گدلا ہو رہا تھا اور اس کی تہہ میں اگی ہوئی کائی کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ پاس ہی ایک پتلی روش پر چھوٹی سی ریشمی گلہری بڑی پھرتی سے ادھر ادھر اچک رہی تھی۔ آس

پاس' کھجور' املتاس اور جامن کی چھدری چھاؤں گھاس کا رنگ گہرا سبز ہو رہا تھا۔ فضا میں مختلف قسم کے پودوں کی خوشبو اور پر سکون مرطوب خنکی سی پھیل رہی تھی۔ بائیں طرف ذرا ہٹ کر ایک دو گنجان درخت تھے جن کے سایوں میں سنگین بنچ پڑے تھے۔ میں مقبرے کی پچھلی طرف آ گیا۔ یہاں نسبتاً زیادہ سکون اور خاموشی تھی۔ سامنے فصیل ہری بھری بیلوں میں چھپی ہوئی تھی اور پرانے کنوئیں کی منڈیر پر بھنگ کی جھاڑیاں اگ رہی تھیں۔ تقریباً نصف گھنٹے تک میں نے مقبرے کا طواف کیا۔ مرمریں برآمدوں کی خنک تاریکی میں ٹہلا' باریک جالی دار جھروکوں سے لگ کر شہنشاہ کے مزار کو دیکھتا رہا۔ ایک آدمی قبر کے سرہانے دو زانو ہو کر بیٹھا تھا اور قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ تلاوت ختم کر کے اس نے دعا مانگی۔ تعویذ کو بڑی عقیدت سے بوسہ دیا اور احتیاط سے جیسے اسے کسی کے جاگ اٹھنے کا احتمال ہو الٹے پاؤں باہر نکل گیا۔ مجھے خواہ مخواہ گمان ہونے لگا کہ میں جہانگیر کے مزار پر نہیں بلکہ داتا گنج بخش کے دربار میں کھڑا ہوں۔

میں مقبرے سے نکل کر پھر باغ میں آ گیا اور ایک جگہ گھاس پر بیٹھ گیا۔ دھوپ سنہری دھوپ درختوں کے آخری کناروں کو چھو رہی تھی اور سائے لمبے اور گہرے ہو چکے تھے۔ بلیک اینڈ وائٹ کا دسواں یا گیارھواں سگریٹ سلگاتے ہوئے خود بخود نور جہاں پر مضمون لکھنے کا خیال آ گیا۔ نور جہاں پر کیا لکھوں؟

میں دیر تک سوچتا رہا۔ نور جہاں مرزا غیاث بیگ کی لڑکی تھی۔ جنگل میں پیدا ہوئی۔ اکبر کے محل میں آ ئی۔ شہزادہ سلیم نے کبوتر پکڑائے' ایک کبوتر اڑ گیا۔ واپس آ کر شہزادے نے حیرانی سے پوچھا۔ "دوسرا کبوتر کیا ہوا؟"

نور جہاں نے بھولپن سے کہا۔ "اڑ گیا صاحب عالم"

"وہ کیسے؟"

"یوں .... صاحب عالم۔" اور نور جہاں نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا۔

اور کبوتروں سے محبت کرنے والے شہزادے کو کنیز کی یہ ادا بھا گئی۔ (جیسا کہ فلم پکار میں بھی دکھایا گیا تھا) وہ اس پر عاشق ہو گیا۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہندوستان کا شہنشاہ بن کر اسے اپنی ملکہ بنائے گا۔ مگر جب وہ شہنشاہ بنا تو نور جہاں علی قلی خاں' اس کی سپاہ کے بہادر جرنیل کی بیوی بن چکی تھی۔ علی قلی خاں بنگال کی مہم پر گیا اور بدقسمتی سے وہاں باغیوں کی سرکوبی کرتے ہوئے مارا گیا۔ نور جہاں بیوہ ہو گئی اور بعد ازاں ملکہ بن کر جہانگیر کے حرم میں آ گئی۔ بس یہ ہے نور جہاں کی کہانی۔ اس سے زیادہ اس موضوع پر کیا لکھا جا سکتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا اور سگریٹ کا نیلا دھواں پتلی مخنی لکیر کی شکل میں اوپر اٹھ رہا تھا۔ میں نے کئی بار نور جہاں کے متعلق

کوئی سنسنی خیز بات سوچنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہا۔

دراصل مجھے رہ رہ کر اس لڑکی کا خیال آ رہا تھا جو بھاٹی دروازے سے نکل کر ٹیکسالی دروازے کی طرف باغ میں گھوم گئی تھی اور جس کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ فہمیدہ تھی۔

میں سوچتا' نور جہاں جہانگیر کی بیوی تھی اور جہانگیر ہندوستان کا شہنشاہ تھا اور اس کے بعد میرا خیال فہمیدہ کی سمت چلا جاتا۔ فہمیدہ، جو کبھی میری محبوبہ تھی اور اب خواجہ غلام نبی کی بیوی ہے اور خواجہ غلام نبی محکمہ انہار کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہے۔ میں شہزادہ سلیم کو نور جہاں کی کبوتر چھوڑنے والی ادا پر مسحور ہوتے دیکھتا اور میرے ذہن میں وہ شام گھوم جاتی جب ہمارے گھر کے نچلے کمرے میں فہمیدہ میری آپا کے ساتھ بیٹھی اپنی دادی کے تتلا تتلا کر بولنے کی نقل اتار رہی تھی۔ وہ ایک آنکھ بند کئے' چھوٹا سا منہ کھولے رک رک کر بول رہی تھی اور میں دروازے والی چق کے ساتھ لگا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کی صورت کتنی مضحکہ خیز مگر کسی قدر دل آویز تھی۔ پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا گویا کوئی رقاصہ گھنگھرو باندھے بھاگ کر میرے پیچھے سے گزر گئی ہو۔ اس کی ہنسی میں ترنم اور نکھار تھا۔ فہمیدہ کی یہ ادا مجھے بھا گئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ تعلیم ختم کر کے جب میں کلرک بنوں گا تو اسے اپنی بیوی بنا لوں گا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ فہمیدہ ہمارے ہاں نہ آئی۔ اسے دوبارہ دیکھنے کی آرزو ایک پر بہار پھول کی مانند میرے دل میں خاموشی سے مہک رہی تھی۔ ایک دن اتفاق سے میرے سوا گھر میں کوئی نہ تھا۔ میں نچلے کمرے میں سماوار میں چائے کے لیے کوئلے سلگا رہا تھا۔ میرا سر کھپ گیا تھا مگر کوئلے سلگنے کا نام نہ لیتے تھے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا دروازہ کھولا تو ڈیوڑھی میں فہمیدہ کھڑی تھی۔ وہی خوبصورت سیاہ چمکیلی آنکھیں' گول ماتھا' نیم وا ہونٹ۔

باجی' باجی کہاں ہے؟

اس نے قدرے گھبراہٹ میں پوچھا۔

باجی۔ باجی اوپر ہے۔ تم بیٹھو میں انہیں بلائے دیتا ہوں۔ میں نے جلدی سے پنڈلیوں تک چڑھے ہوئے پائنچے ٹھیک کئے اور اوپر چلا آیا۔ اوپر مکان سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اب کیا ہو؟ میں نے گھبرائے ہوئے بلے کی طرح کمروں کا چکر کاٹا اور پھر نیچے اتر آیا۔

وہ وہ باجی ذرا نہا رہی ہے۔ کہتی ہے ابھی آتی ہوں۔

فہمیدہ کچھ نہ بولی۔ وہ نقاب الٹے' میز کے پاس بت بنی بیٹھی تھی۔ میں سماوار کو دروازے کی طرف لے آیا۔

کوئلے ذرا گیلے ہیں۔ دھواں تو نہیں لگ رہا؟

بت خاموش رہا۔اس کے سر کے اوپر دیوار لگا کلاک برابر حرکت کر رہا تھا۔ٹک' ٹک' ٹک۔

میں نے کہا۔

کمرہ ٹھنڈا ہے سماوار قریب لے آؤں؟

کلاک چلتا رہا۔بت کچھ نہ بولا۔میں نے کہا۔

تم چائے پیو گی؟

ٹک' ٹک' ٹک۔

تم بولتی کیوں نہیں؟

ٹک' ٹک' ٹک۔

میں بت کی طرف لپکا' بت اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اب جاتی ہوں۔

میں نے جلدی سے اس کے گول گول شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

بیٹھو فہمیدہ۔باجی ابھی آ جائے گی۔

لیکن فہمیدہ میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی اور میری گرفت زیادہ مضبوط ہو گئی۔اس کا بدن سرد پڑ رہا تھا' یا میرا؟ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے یا اس کے۔میں تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ایک کپکپی تھی جو بیک وقت ہم دونوں پر طاری تھی۔ایک گداز اور میٹھا اضطرار تھا جس کی رو میں ہمارے جسم ہم آہنگ ہو کر لرز رہے تھے۔فہمیدہ نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی آواز تھرتھرانے لگی جیسے وہ اپنی دادی کی نقل اتار رہی ہو۔اس کا دل گویا اس کے حلق میں اٹک گیا ہو اور اس کی آواز رک گئی ہو۔اور ہم یوں ایک دوسرے سے مل گئے تھے جیسے دو ٹہنیاں اتفاقاً ایک دوسری سے الجھ گئی ہوں۔فہمیدہ کا سنہری رنگ اڑ رہا تھا۔چمکیلی سیاہ آنکھیں ڈر سے سہمی ہوئی تھیں۔اس کے ہاتھ سرد تھے اور ہونٹ کھلے تھے۔پنکھڑیوں کی طرح۔یہ پنکھڑیاں ان پھولوں کی تھیں جن کی خوشبو اچھوتی تھی اور جن کی تازگی بے داغ اور ان مول تھی اور جن کا بیج قدرت بلند پہاڑیوں کی چوٹیوں پر اپنے ہاتھ سے بکھیرتی ہے اور جن کی خوشبو جنگلوں کو مہکا دیتی ہے۔جب فہمیدہ چلی گئی تو سماوار میں کوئلے دہک رہے تھے۔

اس کے بعد فہمیدہ اکثر ہمارے گھر آنے لگی۔اسی کمرے' اسی کرسی پر بیٹھ کر اس نے روتے ہوئے' مجھ سے وعدے کیے کہ وہ

مجھے کبھی نہیں چھوڑے گی اور زندگی کے ہر دور میں میرا ساتھ دے گی اور میرے شانہ بشانہ ہو کر چلے گی۔ لیکن جب میں تعلیم پانے کے بعد کلرک بنا تو فہمیدہ کسی اور کی ہو چکی تھی۔ ہمارا قافلہ محبت کی شاداب وادیوں کو عبور کر کے جب کارواں سرائے کے قریب پہنچا تو فہمیدہ اسی بھیڑ میں کہیں گم ہو گئی۔

شہزادہ سلیم نے مہرالنساء سے محبت کی اور جب وہ شہنشاہ بنا تو اس نے علی قلی خاں کی بیوہ نور جہاں سے شادی رچالی۔ میں نے فہمیدہ سے محبت کی اور اسے زندگی کے بھرے میلے میں کھو بیٹھا۔

وہ مجھ سے چھین لی گئی۔ اسے ایک علی قلی خاں بیاہ کر لے گیا۔ میں اس علی قلی خاں کو جانتا ہوں۔ اس کا اصلی نام خواجہ غلام نبی ہے اور وہ محکمہ انہار کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہے۔ میں تعلیم ختم کرنے کے بعد جہانگیر نہیں بن سکا۔ کاش میں جہاں گیر ہوتا۔ اور خواجہ غلام نبی اپنے علی قلی خاں کو کسی خوفناک مہم پر بھیج سکتا۔ جہاں سے وہ عمر بھر واپس لوٹ کر نہ آتا۔ اس کی خبر تک نہ ملتی اور میں اس کی چہیتی بیوی' اپنی نور جہاں۔ اپنی فہمیدہ کو گھر بیاہ لاتا۔

میں جہانگیر نہیں ہوں مگر خواجہ غلام نبی علی قلی خان ضرور ہے۔ کیونکہ میری نور جہاں اس کے پاس ہے۔ میری فہمیدہ اس کے قبضے میں ہے۔ شاید اب وہ مجھے بھلا بیٹھی ہو۔ شاید اس کے دل سے میری یاد کی آخری لکیر بھی محو ہو گئی ہو' لیکن میں اسے نہیں بھلا سکتا۔ میں اس شام کو نہیں بھول سکتا جب وہ آپا کے پاس نچلے کمرے میں بیٹھی اپنی دادی کی نقل اتار رہی تھی۔ جہانگیر کو شاید زندگی کے آخری لمحات تک وہ منظر نہ بھولا ہو گا جب نور جہاں نے معصومیت اور بھولپن سے دوسرا کبوتر بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر وہ سنہری لمحات' وہ پھر کبھی واپس نہ آنے والے روشن اور چمکیلے لمحات۔ جب پہلی بار میں نے جنگلی پھولوں کی مہک سونگھی تھی اور ریشمی پلکوں کی سکون بخش حرارت کو محسوس کیا تھا۔ کہاں کھو گئے وہ لمحات!

میری نور جہاں اس دنیا میں زندہ ہے۔ لیکن نہیں وہ مر چکی ہے اور اس کا مزار بھاٹی دروازے کے اندر ہے جس کے باہر کھڑے ہو کر میں نے بس کا انتظار کیا تھا اور جہاں سے ایک دبلے پتلے جسم' ہلکے نیلے برقعے اور سفید سینڈل والی لڑکی ٹکسالی دروازے کی طرف گھوم گئی تھی اور جسے کارپوریشن کے گندگی اٹھانے والے ٹرک نے اپنی اوٹ میں لے لیا تھا۔ وہ ضرور فہمیدہ ہی تھی' نور جہاں ہی تھی!

مجھے شاہدرہ آنے کی بجائے بھاٹی دروازے کے اندر جانا چاہیے تھا' اس نور جہاں کے مزار پر جس کا سلیم جہانگیر نہ بن سکا۔ ہندوستان کا شہنشاہ نہ بن سکا۔ جہانگیر کی نور جہاں مرنے کے باوجود زندہ ہے مگر میری نور جہاں زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہے۔ ایک لاش ہے۔ اور ایسی کتنی ہی لاشوں' کتنی ہی نور جہانوں کے مزار ہیں جو شہر کے اندر' شہر سے باہر تنگ و تاریک گلیوں کے تعفن میں

ویران پڑے ہیں۔ جن کی قبروں پر کوئی چراغ نہیں جل رہا' کوئی پھول نہیں مہک رہا اور جن پر ایک افسانہ کیا ہزاروں ناول لکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے غلطی کی جو شاہدرہ آ گیا۔ مجھے شہر کی گلیوں میں گھومنا چاہیے تھا۔

دن ڈھل چکا تھا۔ شام کے مرطوب سائے مجھے گھیر رہے تھے جامن اور املتاس کے درختوں میں چڑیوں کی چہکاریں گونج رہی تھیں۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ میں آہستہ سے اٹھا۔ کوٹ کے کالر چڑھائے اور باغ کے بڑے دروازے کی طرف ہو لیا۔ بلیک اینڈ وائٹ کا سگریٹ سلگاتے ہوئے مجھے پھر رسالہ ''آثار قدیمہ'' کے ایڈیٹر کا خیال آ گیا۔ جس نے مجھے یہاں سگریٹوں کا ڈبہ دے کر نور جہاں پر افسانہ لکھنے بھیجا تھا۔ ڈبے میں اب صرف تین چار سگریٹ ہی باقی تھے۔ میں نے سوچا گھر جا کر نور جہاں پر کچھ نہ کچھ ضرور گھسیٹ ڈالنا چاہیے۔

لیکن جب میں مقبرے کی چار دیواری سے باہر نکلا تو میری نگاہ ریلوے لائن عبور کرتے ہوئے خود بخود نور جہاں کے مزار کی طرف اٹھ گئی اور میں نے ایمانداری سے محسوس کیا کہ میں نور جہاں کے بارے میں کچھ نہ لکھ سکوں گا چاہے رسالہ ''آثار قدیمہ'' کا ایڈیٹر میرے کوٹ کی ساری جیبیں سگریٹوں سے بھر دے۔

◆◆◆

شنوائی

وہ بھیانک طریقے سے کھانسا اور چھتری کو ایک طرف لٹکاتے ہوئے' پل کے ٹوٹے ہوئے جنگلے کا سہارا لے کر بولا۔ اب وہاں کسی کی شنوائی نہیں۔ ہوا کا ایک خشک جھونکا ہمارے جوتوں پر سڑک کے گردوغبار کا کچھ حصہ پھینک کر سامنے والی بدررو کی پلیا کے نیچے گھس گیا۔ ہمارے سروں پر کروٹین کی لٹکتی ہوئی شاخیں ہوا کے دباؤ سے ایک طرف کو جھک سی گئیں اور اس نے کھسکتی ہوئی چھتری کو اپنی کمزور انگلیوں میں تھام لیا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے جب وہ مجھے ملا تھا تو اس کی صحت عام کلرکوں ایسی تھی اور مجھے اس کی طرف دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوا تھا۔ مگر اس قدر یاد ہے کہ اپنی شادی کی خوشخبری سنانے کی غرض سے جب وہ مسرت سے پھٹے ہوئے بے رنگ دیدے لے کر میری طرف جھکا تھا تو مجھے اس کے کپڑوں اور جسم سے کچھ اس قسم کی بو آئی تھی جو عموماً ایسے گھروں سے نکلا کرتی ہے جہاں سے کسی مردے کو نکلے چند منٹ ہی گزرے ہوں اور میں نے اسے مبارک دیتے ہوئے ایک قسم کا چھپا ہوا سہم اور رشک سا محسوس کیا تھا جیسے مجھے یقین ہو کہ وہ ابھی منہ کے بل گر پڑے گا اور گرتے ہی مر جائے گا۔

اس کے بعد بھی وہ کئی دفعہ مجھے ملا' جب اس کی شادی ہو چکی تھی اور ایک دو بچے بھی پیدا ہو گئے تھے' کبھی محلے والے پرانے گردوارے میں سے نکلتے ہوئے اور کبھی کندھے پر چڑمڑ کیا ہوا کوٹ ڈھلکائے' ہاتھ میں روٹی کا ڈبہ پکڑے اور بغل میں ایک آدھ فائل دبائے دفتر سے لوٹتے ہوئے' گردوارے کی ٹیڑھی بنگی دہلیز سے نکلتے وقت اس کی آنکھیں بندی ہو کر اور زیادہ مرجھا سی جاتی تھیں اور چال میں اس گاڑھے دھوئیں ایسی سستی اور بوجھل پن سا آ جاتا تھا جو صبح کے وقت کارخانوں کی لمبی چمنیوں کے سیاہ سینوں میں سے ابھر ابھر کر اردگرد کی دھندلی فضا پر گھناؤنا اضمحلال طاری کر دیتا ہے۔ اور دفتر سے لوٹتے وقت اس کا نمدہ سا کوٹ اس کے کندھے پر لٹکا جھولتا ہوتا اور وہ سر نہوڑائے' یوں گزرتا جیسے گھر پہنچ کر اسے قدموں کی گنتی اور سڑک کی پیمائش کا حساب دینا ہے۔ موٹریں' تانگے' سائیکل' آدمی' بیل سب کوئی اس کے قریب ہو کر اس کے آگے نکل جاتے' مگر وہ کسی کی طرف نہ دیکھتا۔ اس کا سر ویسے ہی ڈھلکا رہتا اور آنکھیں ویسے ہی متفکر' جیسے سڑک پر کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہی ہیں جس میں سما کر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے دفتر' اپنی ماں' اپنے بچوں اور اپنے گردوارے سے دور ہو جائے۔ اسے ابھی وہ جگہ نہیں ملی تھی۔ وہ تا حال اس جگہ کے حاصل کرنے میں

ناکام تھا جس نے اسے اپنی پرسکوں آغوش میں لے کر اس کی مسلسل الجھنوں کو آخری اطمینان میں تبدیل کرنا تھا۔ چنانچہ وہ ہر صبح اس کی جستجو میں سر جھکائے دفتر کی طرف روانہ ہوتا اور ہر شام ناکام ہو کر واپس ہوتا۔ جب کبھی مجھے ملتا تو باتیں کرتے ہوئے اس کی میلی آنکھوں' ڈاڑھی مونچھوں کے ملے جلے بالوں اور تنگ صدری میں ٹھسے ہوئے جسم کی ہر حرکت سے کسی پوشیدہ غم کی کسک اور کسی چھپے ہوئے زخم کی ٹھیس کا پتہ ملتا۔ جب اس کے میلے ہونٹ ہلتے تو وہ مونچھوں کے الجھے ہوئے بالوں میں سے زیادہ بھدے دکھائی دینے لگتے اور بالوں کی زردی اور کچھ سیاہی دانتوں کے پیلے پن سے مل کر زیادہ کریہہ ہو جاتی۔ مگر ایک گمنام سی ہوس' بے معلوم تڑپ رہ رہ کر اس کے چہرے کی بے ہنگمی اور بے صناعتی پر لوٹ لوٹ سی جاتی اور پھر وہاں سے گندھک نما پیلا سا دھواں بن کر اٹھتی اور اسے اپنی روکھی پھیکی کیلی لپیٹ میں لے لیتی۔ ایک دن وہ مجھے سیڑھیوں والے پل پر اچانک مل گیا اور مجھے وہیں سے اپنے گھر لے گیا۔ ہم شہر کے کھلے اور ہوادار حصوں سے پہلو بچاتے ہوئے بازاروں میں داخل ہو رہے تھے۔ وہاں دونوں طرف جھکے ہوئے چھجوں والے پرانے اور اونچے مکان تھے' جو اپنی آخری منزلوں پر پہنچ کر ایک دوسرے کی طرف زیادہ جھک گئے تھے۔ ارد گرد زیادہ تر صرافوں' پنساریوں اور موزے بیچنے والوں کی دکانیں تھیں۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ ایک تنگ گلی کی طرف مڑا۔ اس گلی کو دونوں طرف کے مکانوں نے کچھ اس طرح سے بھینچ رکھا تھا کہ وہاں ہمارا پہلو بہ پہلو ہو کر گزرنا دشوار تھا۔ ان مکانوں میں سے اکثر کے دروازے اور کھڑکیاں کھلی تھیں اور اندر سے ایسے غیر مانوس بو کے سرد اور سیلے سیلے بھبکے نکل رہے تھے جو ان میں بسنے والوں کی زندگیوں کی بے رنگی اور بے حسی کا سبب بتلا رہے تھے۔ وہ میرے آگے آگے تھا اور میں اس کے پیچھے۔ ان دروازوں میں سے کبھی کبھار اگر کچھ نظر آتا تو تاریک دھوتیوں میں لپٹے ہوئے زرد زرد جسم ہوتے یا کسی چارپائی سے نیچے لٹکتی ہوئی ننگی ٹانگیں۔ وہ اسی طرح کے ایک دروازے کے پاس جا کر رک گیا۔

روٹی کا ڈبہ مجھے پکڑاتے ہوئے اس نے ہاتھ کی سست حرکت سے دروازہ کھٹکھٹایا اور دروازہ ایک ہلکی سی کراہ نما آواز کے ساتھ ذرا سا کھلا اور دو مرجھائی ہوئی زرد آنکھیں مجھے دیکھ کر جھٹ غائب ہو گئیں۔ میں ٹھٹکا اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گیا۔ کمرہ تنگ تھا اور اس کی فضا مال گاڑی کے ڈبے کی طرح سرد اور گھٹی گھٹی سی تھی۔ نیم روشنی اور انتہائی خنکی میں گرد و پیش کی چیزیں مدھم اور ویران سی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک کونے میں ایک گھٹیا قسم کا سنگار میز پڑا تھا جس کا شیشہ کونے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ میز پر صرف دو بوتلیں پڑی تھیں۔ کرسی وغیرہ وہاں کوئی بھی نہیں تھی۔ مگر میرے لیے۔ ایک کرسی اندر سے پکڑا دی گئی' جو لوہے کی تھی اور اس قدر ٹھنڈی ہو رہی تھی کہ اس پر تین منٹ بیٹھے رہنے کے بعد مجھے یوں معلوم ہونے لگا جیسے میری دونوں ٹانگوں پر فالج گر چکا ہے۔ ایک طرف چرخہ پڑا

تھا جو اپنے اوپر رسی سے لٹکتے ہوئے لحاف کو تک رہا تھا جس کی میلی روئی جگہ جگہ سے جھانک رہی تھی۔ چرخے کے قریب ہی ایک پلنگڑی بچھی ہوئی تھی جس پر وہ خود بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جس کی جھریوں سے کسی بچے کے ہلکورے لے لے کر رونے اور کسی کے پچکارنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ اردگرد پر اسراری نیم تاریک دھندلی ہوئی تھی اور کونوں کی ٹھنڈی اور نمدار تاریکیوں سے حسرتناک بیچارگی سی اٹھ اٹھ کر کمرے کی ہر ایک چیز پر گرد کی مانند جم رہی تھی اور ان کی بے حسی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ایسی فضا میں میرے سامنے بیٹھے ہوئے اس کا چہرہ تاریک ہو کر زیادہ ڈراؤنا ہو گیا۔ وہ سر ڈھلکائے' چپ چاپ' کسی مجرم کی طرح سیلی سیلی زمین کو گھورتے ہوئے بولا۔ میں یہاں مدت سے زندگی گزار رہا ہوں۔ گو یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ ایک دن میری بیوی نہا رہی تھی کہ ڈر گئی۔ پھر اسے بہت تیز بخار ہو گیا۔ وہ روز کہتی ہے کہ میں یہ مکان چھوڑ دوں' مگر میں سوچتا ہوں اسے چھوڑ کر کدھر جاؤں۔ اور پھر میں یہاں مدت سے زندگی گزار رہا ہوں۔ وہ باتیں کئے جا رہا تھا اور اس کی آواز مدھم ہو کر پھیکی پڑ رہی تھی۔ اس کا سر زیادہ جھک گیا تھا جیسے پینک میں آ گیا ہو۔ پھر وہیں سے آنکھیں اٹھا کر اس نے میری جانب دیکھا اور اس کی بے رنگ نگاہیں اس ماحول میں بھیانک طور پر سنجیدہ ہو گئیں۔ کیا تم سمجھتے ہو میں اسی طرح زندہ رہوں گا؟ نہیں' یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن' زندگی میرے لیے اجیرن سہی' میں نا امید نہیں ہوں۔ میری ترقی کی درخواست میرے آفیسر کی میز پر پہنچ چکی ہے۔ چار سال کی سروس کے بعد یہ میری پہلی درخواست ہے۔ اسے یقیناً منظور کرنا ہو گا۔ اور پھر خدا کو میرا خیال نہیں کیا؟ ایک ذلیل قسم کی مجبوری اور بے بسی اس کے تنگ سینے سے ایک ہلکی آہ کے ساتھ نکلی اور چپکے سے اس کی پژمردہ آنکھوں میں داخل ہو گئی' پھر اس کے سینے نے مسلسل بیچارگیاں اگلیں اور خود بخود ڈھیلا پڑ گیا اور گردن لٹکا کر کسی گہری فکر کا شکار ہو گیا۔ میں غور سے اس کی طرف دیکھا اور میلی بے ترتیب داڑھی اور مرجھائی ہوئی مختصر پیشانی پر مجھے بچپن کے مبہم سے نقوش ڈوبتے ابھرتے دکھائی دیئے۔ وہ وہ ہمارا مکان ہے' وہ سامنے ان کا مکان ہے۔

گلی کی نکڑ پر بالکل ہمارے مکان کی مانند' ایک ہی طرح کی پرانی اینٹوں اور گارے سے بنا ہوا دو منزل' تنگ دروازوں اور نیم تاریک کوٹھڑیوں والا۔ مکان تلے ان کی اپنی دوکان ہے' جس کی میلی گدی پر گھٹنے چھاتی سے لگائے' اس کا بوڑھا باپ' سارا دن اکڑوں بیٹھا شربت اور کھانسی وغیرہ کی دوائیاں بیچتا رہتا ہے۔ اسکے سر کو میلا لے رنگ کی بھاری سی پگڑی کنٹوپ کی مانند ڈھانپے ہوئے ہے اور مونچھوں کے سفید بال آبشار کی صورت میں اس کے منہ سے ہوتے ہوئے ڈاڑھی کے گھنے بالوں میں گھل مل گئے ہیں۔ وہ تمام وقت گردن نہوڑے اونگھتا رہتا ہے۔ اور کبھی کبھی چونک اٹھتا ہے اور اپنی کرنجی آنکھیں جھپکاتے ہوئے گزرنے والوں کو دیکھ لیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس کے اندر کافی روپیہ ہے جسے اس کے باپ نے بڑی محنت سے اکٹھا کیا تھا اور اب وہ جسے ضرورت مند لوگوں میں

تقسیم کر دیتا ہے۔شربت کے گاہک اور کھانسی وغیرہ کے مریض اس کے ہاں بہت کم آتے ہیں۔مگر ایسے گاہکوں کی آمد پر وہ کھنکار کر سنبھل جاتا ہے' جو خاموشی سے اس کے قریب آتے ہیں اور لمحہ بھر یونہی ادھر ادھر گھورنے کے بعد جیب سے کوئی چمکدار شے نکال کر اس کی طرف لڑھکا دیتے ہیں۔پھر وہ اپنی کمزور ٹانگوں کے سہارے کانپتا' لرزتا' اس چمکدار شے کو اندر لے جاتا ہے اور ایک سیاہ سے پتھر پر اسے اچھی طرح ٹھونک بجا کر جانچتا ہے' پھر وہاں سے بھی لڑکھڑاتا ہوا سب سے پچھلے کمرے میں چلا جاتا ہے۔اور جب واپس نمودار ہوتا ہے تو اس کی بوڑھی انگلیوں میں ضرورت مند لوگوں کے لیے نوٹ لرزتے ہوتے ہیں۔وہ بڑی مدت سے اسی طرح کانپتا لرزتا اندر جاتا ہے اور واپسی نوٹ گنتا ہوا آتا ہے۔وہ ہمارا اسکول ہے' کسی خانقاہ کی مانند بلوط اور جامن کے درختوں میں گرا ہوا۔پراسرار' گہرا گہرا خاموش۔شہر سے پرے' نہر کی طرف جانے والی پکی سڑک کے کنارے' ہم دونوں روزانہ بستے ہاتھوں میں لٹکائے' ادھر ادھر شرارتی آنکھوں سے تکتے' ہنستے مسکراتے وہاں تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں۔سکول کی پرانی قلعہ نما عمارت کو اینٹ اور چونے کی ڈیڑھ مرد اونچی دیوار گھیرے ہوئے ہے' جو کئی جگہ سے جھڑ گئی ہے اور اینٹیں اکھڑ گئی ہیں۔ایک دو جگہ سے عشق پیچاں کے کاسنی پھولوں نے اسے ڈھانپ رکھا ہے۔اسکول کی پشت کی جانب سایہ دار گھنے درختوں کے درمیان ایک تکیہ ہے جہاں کئی قسم کے لوگ کبھی درختوں کی چھاؤں میں چارپائیوں پر لیٹے تمباکو پیتے رہتے ہیں اور کبھی کچھ گھوٹتے رہتے ہیں۔ہماری جماعت کی کھڑکی اسی طرف کھلتی ہے۔ہم دونوں کھڑکی کے پاس ایک ہی بنچ پر بیٹھتے ہیں۔جس وقت آدھی چھٹی ہوتی ہے تو ہم اسی تکیہ والے درختوں کی چھاؤں میں ایک جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں۔

مجھے یاد ہے ایک دن ہم وہیں بیٹھے کبھی ہنس ہنس کر لوٹ رہے تھے اور کبھی خاموشی سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ اس نے اپنی کہنی کے ایک اضطراری ٹہوکے سے مجھے ایک طرف متوجہ کرایا اور پھر حیرت سے مجھے تکنے لگا۔نہیں یار ماسٹر شاید بادام گھوٹ رہا ہے' وہ میری اس بات پر زور سے کھلکھلا اٹھا۔سامنے ایک غیر ہموار ریتیلا میدان ہے جو دور تک پھیلا ہوا ہے۔دوپہر کے وقت وہاں سوائے چند ایک کتوں کے اور کوئی نظر نہیں آتا' جو اینٹھ اینٹھ کر ادھر ادھر گرد اڑاتے پھرتے ہیں۔میدان کی دوسری طرف گنجان درختوں کا سلسلہ ہے جو اپنے گہرے سایوں میں ندی کو ڈھانپے ہوئے ہے۔وہ مدتوں سے بوڑھی ندی کو گھیرے کھڑے ہیں۔یہ کچھ اس قسم کے درخت ہیں کہ نہ تو خزاں ان کے پتے جھاڑ کر انہیں برہنہ کرتی ہے اور نہ بہار کی دل فریبیاں انہیں نیلے پیلے تر و تازہ اور خوشبودار پھولوں سے سجاتی ہیں۔وہ موسمی کیفیتوں سے بے نیاز' سر جھکائے برسوں سے اپنی دھن میں مست کھڑے ہیں۔جب کبھی آسمان پر گہرے بادل امڈ آتے ہیں اور ریتلے میدان کی تپش خوشگوار ٹھنڈی ہواؤں کو جذب کر لیتی ہے تو ہم دونوں اسکول سے بھاگ

کر نہر کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ہم کھیتوں کی مرطوب خوشبوؤں سے لدی ہوئی لطیف ہواؤں کی خنکی سونگھتے ہیں اور آزاد فضاؤں کی مسرتیں محسوس کرتے اور جب نہر میں چھلانگیں لگا لگا کر چور ہو جاتے ہیں تو وہیں سے نہر کی پٹڑی پر سے ہوتے ہوئے گھر کی طرف ہو لیتے ہیں۔ پھر ہم ہائی سکول میں آ گئے ہیں۔ یہاں بھی ہم اکھٹے روانہ ہوتے ہیں اور اکٹھے واپس آتے ہیں۔ کبھی کبھی میں ان کی دکان سے شربت پی لیتا ہوں' مگر اس کا بوڑھا باپ مجھ سے دو ہی پیسے رکھوا لیتا ہے' پھر دفعتاً وہ خاموش رہنے لگا۔ میرے زیادہ بولنے پر بھی وہ بہت ہی کم بولتا اور اکثر کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا' ایک دن ہم حسب معمول واپس آ رہے تھے میں اس کی ایک بات پر زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا اور وہ بھی دبے دبے ہنس رہا تھا کہ معاً وہ چپ ہو گیا اور بغیر میری طرف دیکھے کہنے لگا دیکھو! میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے کہ میں آئندہ زندگی میں کیا کرنے والا ہوں' مگر تم کیوں خاموش ہو؟ تم مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ مستقبل میں تم کیا کرو گے؟ اور میرا جواب سن کر وہ رک کر حیرانی سے مجھے تکنے لگا۔ تو کیا؟ تو کیا تم وہ ہر بات قبول کر لو گے جو زندگی تمہیں پیش کرے گی؟ کیا تمہیں مستقبل سے کوئی توقع نہیں؟ کیا صرف زندہ رہنا چاہتے ہو؟ نہیں نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ناممکن ہے' تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم بھی میری طرح کسی دوسرے ملک میں جا کر قسمت آزمائی کرو گے؟ میں تم سے مطمئن نہیں ہوں۔

ہم حسب معمول مانوس بازاروں' جانی پہچانی دوکانوں اور مانوس فضاؤں میں سے گزر رہے ہیں' روز کی طرح ہم لوگوں کو مکانوں اور دکانوں میں سے نکل نکل کر سڑک پر گم ہوتے اور سڑک پر سے مکانوں اور دکانوں میں داخل ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں چھڑکاؤ کرنے والی گاڑیاں اور سڑک صاف کرنے والے بھنگی مل رہے ہیں اور وقت گزر رہا ہے۔ پھر ایک دن یوں ہوتا ہے کہ ہم اسکول سے نکل رہے ہیں اور ہماری جیبوں میں میٹرک کے سرٹیفکیٹ پڑے ہوئے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ زندگی ہمارے سامنے ایک وسیع میدان کی مانند پھیلی ہوئی ہے اور مختلف راستے اسے ادھر ادھر سے کچھ اس طرح کاٹ رہے ہیں کہ وہاں کئی دوراہے اور کئی چوراہے بن گئے ہیں اور جیسے ہر دوراہے اور ہر چوراہے سے ہمیں کوئی نہ کوئی آواز اپنی طرف بلا رہی ہے۔ اور پھر پھر ایک روز اچانک اس کا بوڑھا باپ شربت کی بوتلوں کے سامنے میلی کچیلی گدی پر اونگھتے اونگھتے لڑکھڑایا اور لڑھک کر مر گیا۔ اس کا نحیف جسم اینٹھ کر اکڑ گیا اور اس کی ہاتھ پاؤں کی انگلیاں ایک طرف کو مڑ گئیں' ہم اس کی ارتھی کے ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔ وہ سر جھکائے ہولے ہولے سسک رہا ہے اور ارتھی شمشان سے قریب ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے بعد اس کی بچی کھچی زندہ دلی نے بھی گہری سنجیدگی اختیار کر لی' پھر اس کی میلی کچیلی گدی پر اس کا ایک رشتہ دار بیٹھا شربت اور کھانسی وغیرہ کی دوائیاں بیچ رہا ہے۔ وہ گھٹنے چھاتی سے نہیں لگاتا مگر بیٹھے بیٹھے وہ بھی اونگھ جاتا ہے۔ چمکدار چیزیں اس کے آگے بھی لڑھکائی جا رہی ہیں اور وہ انہیں ٹھونک بجا کر نوٹوں کی شکل دے کر انہیں ضرورت مند لوگوں

میں بانٹ رہا ہے پھر ایک روز جبکہ شام پر سکون اور گرم ہے' ان کے گھر سے اسباب باہر نکالا جا رہا ہے۔ چارپائیاں' پرانے صندوق چھوٹے بڑے' جست کے لکڑی کے میل سے بھرے ہوئے لحاف' بغیر قلعی کے برتن' طوطے کا پنجرہ۔ وہ مکان خالی کر رہے ہیں۔ مگر جھکے ہوئے چھجے تلے شربت کی بوتلیں بدستور مکھیوں سے اٹی پڑی ہیں۔ شربت وغیرہ بدستور کم بک رہا ہے اور نوٹوں کی سرپڑ زیادہ ہو رہی ہے۔ پانی گرم کرنے والے حمام کی ٹونٹی پکڑے وہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم نے مکان چھوڑ دیا ہے۔ ماموں نے دوکان سنبھال لی ہے۔

پھر دو سال یونہی گزر جاتے ہیں نہ وہ مجھے ملتا ہے اور نہ میں اسے دفعتاً وہ ایک روز بازار میں سے گزر رہا ہے۔ میرے ساتھ چلو ہم شہر سے باہر چلیں گے۔ اور ہم دونوں اس سڑک پر چل رہے ہیں جو کچی ہے اور شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ شام انتہائی پر مسرت ہے اور نیم گرم ہوا کے مہربان جھونکے ہمارے جسموں کو تھپتھپا رہے ہیں۔ مغرب میں سورج غروب ہونے والا ہے اور سائے گہرے ہو رہے ہیں۔ میں ایک جگہ ملازم ہو گیا ہوں۔ اچھے پیسے مل جاتے ہیں۔ ماں چونکہ سخت بیمار ہے اس لیے وہ اگلے ماہ میری شادی رچا رہی ہے' تمہیں ضرور آنا ہو گا۔ ہمارے دائیں بائیں تربوزوں کے ناہموار کھیت ہیں جو ڈوبتی شام کے مدھم سایوں میں دھندلا رہے ہیں۔ سر خالی ہے اور ہمارے ارد گرد کوئی درخت نہیں۔ دور تک اڑتی ہوئی گرد کی خاکستری سی چادر تنی ہوئے ہے کبھی کبھی کوئی راہگیر ہمارے پاس سے تیزی سے گزر جاتا ہے اور تھوڑی دور جا کر اپنی ہی گرد میں گم ہو جاتا ہے۔ تم ہی کہو۔ کیا یہ سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے۔ نا؟ کیا میں جلدی تو نہیں کر رہا؟ شاید مجھے ابھی شادی نہیں کرنی چاہیے تھی' مگر ماں کہتی ہے کہ یہ اس کی آخری خواہش ہے اور وہ سخت بیمار ہے' وہ یونہی کبھی کچھ بولتا ہے اور کبھی خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کی مدھم آواز شام کی اداس فضا میں تھوڑی دیر گونج کر کہیں ڈوب جاتی ہے۔ پھر ہم واپس مڑ رہے ہیں۔ اور سورج افق کے کنارے عبور کر چکا ہے۔ دور بستی کے مکان مدھم اور غیر معلوم سے نظر آ رہے ہیں۔ کہیں کہیں کسی کھڑکی یا روشندان سے گدلی گدلی زرد روشنی بیماروں کی طرح افسردگی سے جھانک رہی ہے' ایک دو جگہ سے دھواں اٹھ اٹھ کر سوز مسلسل کی مانند ہولے ہولے رینگ رہا ہے اور ہمیں تربوز کے کھیتوں کی صرف اگلی قطاریں صاف نظر آ رہی ہیں۔ اس کا چہرہ ایک بے معلوم دھبے میں تبدیل ہو گیا ہے اور خدوخال زیادہ گہرے ہو گئے ہیں' پھر جیسے دور سے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ کبھی مجھے خیال آتا ہے اگر میں مر گیا تو کیا ہو گا؟ پھر میری ماں کیا کرے گی؟ ایک لمحے کے لیے سوچتا ہوں جیسے میں مر بھی گیا تو کچھ نہیں ہو گا۔ یہ سڑک جس پر ہم جا رہے ہیں اسی طرح رہے گی اور ماں بھی تھوڑا بہت غم کر کے مجھے بھول جائے گی اور اگر میں شادی کے دن مر گیا تو؟ مگر یوں کبھی نہیں ہو گا۔ شادی کے دن مرنا انتہائی حسرت ناک ہو گا۔ پھر مجھے اس کے جسم سے موم اور کافور کی بو آ رہی ہے اور میں محسوس کر

رہا ہوں جیسے وہ ابھی گر پڑے گا اور گرتے ہی مر جائے گا۔ اس کا چہرہ کبھی مسرور ہو کر چمک اٹھتا ہے اور کبھی خود بخود زرد ہو کر گہرا مایوس ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کے اندر کوئی گہری آرزو ہے' پوشیدہ ہوس ہے' جو کبھی اسے حسین دنیاؤں کے خواب دکھاتی ہے اور کبھی شدید ناکامیوں کے تاریک خلاؤں میں گھسیٹ کر لے جاتی ہے۔ وہ چلا جا رہا ہے' چپ چاپ' خاموش' کبھی نگاہیں اٹھا کر بستی کے مکانوں کی طرف دیکھ لیتا ہے جو رات کی سیاہیوں میں گم ہو چکے ہیں اور اپنے پیچھے ٹمٹمائی ہوئی مدھم روشنیاں چھوڑ گئے ہیں' اور کبھی خاموشی سے نظریں جھکا لیتا ہے۔ وہ کبھی بیزار ہے اور کبھی مطمئن' گویا اندر ہی اندر' بغیر کسی کو خبر دیئے وہ اپنی استعداد کا تجزیہ کر رہا ہے' اپنی خامیوں پر وہ جھنجلا اٹھتا ہے اور خوبیوں پر اسے صدمہ ہوتا ہے کہ اس میں خامیاں کیوں ہیں۔ ایک دفعہ پھر گہری خاموشیوں سے ایک آواز ابھرتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ شادی کے بعد میری زندگی کیا ہو' ہو سکتا ہے میرے قدم زیادہ مضبوطی سے جم جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے جمے ہوئے قدم بھی اکھڑ پڑیں۔ جوا ضرور کھیلنے والا ہوں' مگر جیت کا مجھے یقین ہے۔ کھیتوں میں سے گیلی مٹی کی مرطوب خوشبو کے ساتھ تربوزوں کی خوشگوار خوشبو اٹھ رہی ہے۔ یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے کسی نے تازہ تربوز کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ آسمان گہرا نیلا ہو گیا ہے اور وہاں رات کے اولین زرد ستارے جھلملا رہے ہیں۔ اس نے خاموش ہو کر حسب معمول سر جھکا لیا ہے' آخر وہ ایک تنگ بازار کی طرف مڑ رہا ہے جہاں چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے اندر باہر روشنیاں ٹمٹما رہی ہیں اور ہم پھر جدا ہو رہے ہیں۔ تین سال' پورے تین سال غائب رہنے کے بعد میں ایک دفعہ پھر اسے ایک گھٹیا قسم کے ریستوران میں دیکھ رہا ہوں۔ کمرہ تمباکو کے دھوئیں سے تاریک ہو رہا ہے اور وہ ایک میز کے کنارے بیٹھا چائے پی رہا ہے۔ سگریٹوں کی خوشبو کے ساتھ چائے کی فرحت بخش خوشبو مخلوط ہو رہی ہے اور ارد گرد چمچوں گلاسوں اور پیالیوں کے رکھنے اور اٹھانے کے شور میں قہقہوں کی آوازیں ملی جلی ہیں۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ اتر گیا ہے' ڈاڑھی کے بالوں میں سفید بال کثرت سے اگ آئے ہیں اور گالوں کی ہڈیاں چٹانوں کی طرح ابھر آئی ہیں' اس کے خدوخال میں کچھ ایسی بات پیدا ہو گئی ہے جو باآواز بلند کہہ رہی ہے کہ وہ پہلے سے بہت زیادہ نحیف' کمزور اور زرد ہو گیا ہے۔

ہساں! میں نے زندگی کا ایک طویل عرصہ اس تنگ اور تاریک ماحول میں بسر کیا' صرف اس امید پر کہ جب میں واپس وطن آؤں گا تو میری بیوی ایک خوش قسمت انسان کی بیوی ہو گی اور میرے بچے ایک کامیاب باپ کے بیٹے ہوں گے' پر پھر وہ آہستہ سے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھ رہا ہے اور مجھے اس کی آنکھیں دیکھ کر شدید احساس ہو رہا ہے کہ وہاں گہری بے بسی' افسردگی اور عبرت انگیز ناامیدی جنم لے چکی ہے۔ اس کا رنگ پھیکا اور پیازی ہو کر زعفران کے کھیتوں کی یاد دلا رہا ہے۔ قدرت کو یہ منظور نہ تھا' لوگ پردیس جاتے ہیں اور ان کی قسمتیں چمک اٹھتی ہیں اور میں اپنی رہی سہی چمک بھی کھو آیا' پھر چائے کی پیالی جو اس نے دیر سے ہاتھ میں پکڑ

رکھی ہے اور جس میں چائے ٹھنڈی پڑ گئی ہے لرزنے لگی ہے اور میز پر رکھتے ہوئے وہ اسی سطح سے بجنے لگتی ہے۔ دھوئیں سے بھرے ہوئے دھندلے ماحول میں پھر اس کی مردہ آواز ابھرتی ہے' اب مجھے کسی سے کوئی توقع نہیں' نہ ان لوگوں سے نہ اپنے خدا سے۔ میں یہاں ایک دفعہ پھر ملازم ہو گیا ہوں' اچھے پیسے بن جاتے ہیں' ہم لوگ اچھی طرح گزارہ کر رہے ہیں۔ اور پھر؟

پھر....... اچانک دروازے کے پیچھے بچے نے ہلکورے لے لے کر رونا شروع کر دیا اور میں معاً خیالات سے چونک پڑا' وہ بدستور جسم ڈھیلا چھوڑے' سر لٹکائے گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا اور کونے میں پڑا چرخہ پھٹے ہوئے لحاف کی میلی روئی کو تک رہا تھا۔ بچہ زیادہ زور سے رونے لگ پڑا۔ اب کی دفعہ کوئی بھی اسے ماتا بھری پچکار سے چپ نہ کرا رہا تھا اور اس نے پلنگڑی پر بیٹھے بیٹھے ایک تکلیف زدہ انداز میں بند دروازے کی طرف دیکھا۔ یہ پھنسیوں کی وجہ سے اب بہت تنگ کرتا ہے مگر وہ کیا کرے؟ وہ خود بخود بیمار ہے۔ ٹھہرو' میں ابھی آیا۔ وہ ایک کراہ نما چراہٹ سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا' پھر خود بخود ہی رکا اور پلٹ کر میری طرف دیکھنے لگا' میں حیران رہ گیا جب میں نے اس کے مرجھائے ہوئے پژمردہ چہرے پر جمی ہوئی مسکراہٹ کو برف کے تودے کی مانند رینگتے ہوئے پایا۔ تم کچھ پیو گے؟ اور تم سگریٹ پیا کرتے ہو' فکر نہ کرو' اگر تم پینا چاہو تو میں تمہارے لیے بازار سے منگوالوں گا۔ مگر میرے انکار پر وہ دروازہ کھول دوسری طرف چلا گیا۔ دروازے کی دوسری طرف شاید چھوٹا سا صحن تھا' تھوڑی دیر کے لیے اس کے بوجھل قدموں کی آواز کھل کر ہوا میں پھیلی اور سمٹ کر کہیں ڈوب گئی۔ اس کے بعد مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر ایک آواز آئی جو کسی چیز کے سیلی سیلی زمین پر گرنے کی تھی۔ پھر مدھم سرگوشیاں' جیسے کسی بند صندوق میں سے ابھر رہی ہوں اور پھر گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔ گھٹیا قسم کے سنگاردان کے ٹوٹے ہوئے دھندلے شیشے میں سے کسی انتہائی غمناک چہرے نے جھک کر میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے غائب ہو گیا۔ گو یہ مکان آسیب زدہ ہے' مگر' میں لرزا اور مجھے وہاں کی تنگی اور خنکی سے شدید خوف اور وہم سا محسوس ہونے لگا۔ اگر کوئی چپکے سے آ کر میرے پیچھے کھڑا ہو گیا ہو اور بڑے اطمینان سے چھری نکال کر میری پشت میں گھونپنے والا ہو تو۔ اور مجھے یوں سنائی دیا جیسے کوئی دبے دبے میرے پیچھے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر پیچھے کی طرف دیکھا اور چھت کی کسی درز میں کوئی جھینگر تھوڑی دیر بول کر چپ ہو گیا۔ پھر معاً کچھ اس طرح کی دھندلی دھندلی مبہم سی پرچھائیاں' گہرے تاریک اور نمدار کونوں میں سے ابھر ابھر کر میری طرف بڑھنے لگیں جنہیں دیکھ کر مجھے بے اختیار وہ ڈراؤنی روحیں یاد آ گئیں جو اجڑے ہوئے ہسپتال کی نیم تاریک لمبی غلام گردشوں اور ویران حویلیوں کے گرد آلود فرشوں پر ادھر ادھر آوارہ پھرا کرتی ہیں' دھوئیں کی ایک مہین سی چادر کی مانند وہ میرے اردگرد تن گئیں اور انہوں نے رک رک' ٹھہر ٹھہر کر والہانہ انداز میں تھرکنا شروع کر دیا۔ میں ڈر کر کرسی میں

سمٹ گیا اور میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ اس کے بعد وہ دفعتاً ایک بھدی لکیر کی شکل میں آدھ کھلے دروازے میں سے گزرتی ہوئی دوسری طرف چلی گئیں، جس طرف سے بچے کے رونے کی دردناک آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ میں نے گہرا سانس لیا اور ایکا ایکی مجھے خیال آیا جیسے وہ پراسرار پرچھائیاں، جن کے جسموں پر بدنما پھنسیاں تھیں اور چہرے بخار آلود اور مرجھائے ہوئے تھے، دوسری طرف شاید اس کی تلاش میں گئی ہیں۔ مجھے گھٹی ہوئی نیم روشن خنک فضا میں غمناک صدائیں سنائی دیں۔ پھر کچی ہڈیوں کے کڑکڑانے کی آوازیں، جیسے میرے قریب ہی کوئی کتا کسی مرے ہوئے بچے کی ٹانگ چبا رہا ہو۔ سنگاردان کے دھندلے شیشے میں سے پھر کسی افسردہ چہرے نے تھوڑی دیر جھانک کر آنکھیں بند کر لیں اور غائب ہو گیا اور پھر۔

پھر جس وقت ہم تنگ، بھنچی ہوئی، ٹھنڈی اور بدبودار گلیوں میں سے نکل رہے تھے تو دن ڈوب رہا تھا، سورج افق کے کناروں تک پہنچ چکا تھا اور بلند مکانوں کی چوٹیاں شام کی ملگجی دھند میں دھندلا سی رہی تھیں۔ ہم صرافوں، پنساریوں اور موزے بیچنے والوں کی دوکانوں کے پاس سے گزر رہے تھے۔ بازار میں لوگ یوں سر جھکائے آ اور جا رہے تھے گویا وہ غمناک آنکھوں سے کسی جنازے کو کاندھا دینے کے لیے تیار آگے بڑھ رہے ہیں۔ دوکانوں کے اندر باہر کہیں زرد دیئے افسردگی سے ٹمٹما رہے تھے، تنگ اور گھٹے ہوئے بدبودار کمرے میں سے نکل کر میں شام کی نکھری ہوئی پاکیزہ اور کھلی ہوا میں سانس لینے پر از حد مسرور تھا، اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت وہ مجھ سے جدا ہونے کے لیے رکا تھا تو وہ پھنسیوں سے بھرے ہوئے جسموں اور بخار آلود چہروں والی دھندلی پرچھائیاں ہم سے فاصلے پر ایک ہجوم کی صورت میں کھڑی ہماری طرف للچائی ہوئی نظروں سے تک رہی تھیں۔ اور جب میں اس سے علیحدہ ہو کر موڑ مڑنے لگا تھا تو میں نے دیکھا کہ دھوئیں کی ایک بھدی لکیر اس کے تعاقب میں تھی۔

ہوا کے ایک دم رک جانے سے ہمارے سروں پر کروٹین کی پتلی پتلی لچکدار شاخیں نیم جاں سی ہو کر لٹکنے لگیں، اور وہ ایک ہاتھ صدری کی جیب میں ٹھسائے دوسرے ہاتھ سے چھتری تھامے سڑک کی ڈھلوان کی طرف دیکھنے لگا جہاں گلے سڑے پتے، ردی کاغذ اور مسلی ہوئی ڈبیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ کام کرتے کرتے کبھی کبھی چھاتی میں ٹیس سی اٹھتی ہے، اور آنکھوں تلے گہرا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ پھر رات کے وقت ہلکا ہلکا بخار ہو جاتا ہے۔ وہ ایک دفعہ پھر کھانسا اور اس کی کھانسی نے کسی ایسی خفیہ بات کی طرف اشارہ کیا جو انتہائی خوفناک اور مایوس کن تھی۔

سوچتا ہوں نوکری چھوڑ دوں۔ مگر، مگر پھر کدھر جاؤں؟ اور جب وہ ٹوٹے ہوئے جنگلے سے اپنے تئیں اٹھ کر چلنے لگا تو ایک دفعہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ مگر وہ جلد سنبھل گیا اور رک رک کر کھانستا ہوا سڑک کی ڈھلوان میں غائب ہو گیا۔ جس وقت میں پل کو عبور کر رہا تھا

تو اچانک مجھے وہ شام یاد آ گئی جب تربوز کے غیر ہموار کھیتوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے' تربوزوں اور گیلی مٹی کی مرطوب خوشبوؤں میں اس نے مدھم آواز میں کہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں سوچتا ہوں جیسے میں مر بھی گیا تو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ سڑک جس پر ہم جا رہے ہیں اسی طرح رہے گی اور ماں بھی تھوڑا بہت غم کر کے مجھے بھول جائے گی۔ اور پھر مط▯ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پل کے اس پار' سڑکوں کے کنارے وہ مردہ پڑا ہے اور اس کی اگلی ہوئی خونی قے اور اس کے کھلے منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔

◆◆◆

بہار سے پہلے، بہار کے بعد

میں ابھی تک اس لڑکی کو نہیں پہچان سکا جو مجھے زنانہ ہسپتال کے دروازے پر ملی تھی اور جس نے اپنا نام اختر بتایا تھا۔ وہ کالا برقع اوڑھے ہسپتال کے باہر گندے نالے کے پل پر بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا جس کی آنکھیں سوج کر لال ہو رہی تھیں اور وہاں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ مجھے قریب سے گزرتے دیکھ کر اس لڑکی نے مجھے میرے نام سے پکارا اور نقاب الٹتے ہوئے بولی۔

تم نے مجھے پہچانا نہیں؟

اس کا رنگ جو کبھی گورا ہوگا اب دھواں کھائی ہوئی لکڑی کی رنگت اختیار کر رہا تھا اور ماتھے کے پسینے میں سیاہ برقعے کا کچا رنگ گھل رہا تھا۔ نچلے ہونٹ کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے سے نمودار ہو رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا بھوسلے رنگ کی تپائی پر دورا کھودان پڑے ہیں۔ چہرے پر روکھا پھیکا تبسم تھا' جس کی افسردہ لکیریں ڈھیلی کمانوں کی مانند رخساروں کی ہڈیوں سے لے کر ہونٹوں کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کمانوں سے نکلے ہوئے تیر جانے کہاں کھو گئے تھے۔ پہلے تو میں بالکل حیران' بت بنا کھڑا رہا۔ لیکن جلد ہی سنبھل گیا اور اس کے قریب ہی پل پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ تھکی تھکی' بجھی بجھی آواز میں مجھے بتانے لگی کہ ہندوستان میں ان کے تینوں مکان نذر آتش کر دیئے گئے اور ان کے قافلے پر کئی بار حملے ہوئے۔ وہ لوگ جانیں بچا کر بمشکل پاکستان کی سرحد پر پہنچے اور یہاں جو مکان انہیں الاٹ ہوا ہے اس کا آدھا حصہ جلا ہوا ہے اور باقی آدھے حصے کے دروازوں اور کھڑکیوں کے پٹ لوگ اکھاڑ کر لے گئے ہیں۔ انہوں نے دروازوں پر بوریئے لٹکا دیئے ہیں اور کھڑکیوں میں اینٹیں چن دی ہیں پھر بھی گرمیوں میں جھلسا دینے والی لو اور سردیوں میں برفیلی ہوائیں کمروں میں گھوما کرتی ہیں اور ان کے مکان سے کوئی مال نہیں نکلا۔ لوگ تو پہلے ہی سے صفایا کر گئے تھے۔ کان پور میں اپنا سارا کاروبار تباہ ہو جانے کے بعد اس کے خاوند نے لوکو شاپ میں ملازمت کر لی ہے۔ لیکن سوا سو روپے میں پورے کنبے کا گزارہ نہیں ہوتا' چنانچہ وہ خود نوکری کی تلاش میں ہسپتال کے باہر بیٹھی دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہی ہے۔

یہاں کونسی نوکری ہے؟

زینب دائی نے بتایا تھا کہ یہاں نرسوں کا ہاتھ بٹانے والیوں کی ضرورت ہے۔

میں نے سر جھکا لیا۔ سڑک پر کاریں اور بسیں گزر رہی تھیں اور گرد کے جھکڑ ناچ رہے تھے۔ اچانک بچہ زور زور سے رونے لگا۔ اس لڑکی نے سڑک کی جانب پشت کر کے ایک طرف سے قمیض اوپر اٹھائی اور چھاتی بچے کے منہ میں دے کر اسے کوسنے لگی۔

''کوئی وقت بھی ہے تمہارے دودھ کا؟ تم تو خون پی گئے ہو میرا۔''

ایک بچہ اس کے پیٹ میں بھی تھا۔ ایک اور بچہ اور ایک اور جونک!

تھوڑی دیر کے بعد ہسپتال کا دروازہ کھل گیا۔ وہ لڑکی قمیض ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

آپا آج کل کہاں ہے؟ اس کے بچے کیسے ہیں؟

تم لوگ کہاں رہتے ہو؟ خالہ سے کہنا اختر سلام کہتی تھی۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔

''دروازہ کھل گیا ہے۔''

اس نے بچہ کندھے سے لگایا اور چپل گھسیٹتی ہسپتال کے اندر جا کر ایک طرف گھوم گئی۔ میں آہستہ سے اٹھا اور سر جھکائے ایک طرف چلنے لگا۔

خالہ سے کہنا اختر سلام کہتی تھی۔ اختر سلام

کہتی تھی۔ اختر اختر!

کہتی تھی اختر اختر!

یہ آواز۔ تھکی تھکی، بجھی بجھی آواز دور تک میرے ساتھ گئی اور میں اس اختر کے متعلق سوچتا رہا جس کے پھٹے ہوئے ہونٹ سوکھی ندی کے بنجر کنارے تھے اور جس کی آنکھوں میں جلے بجھے سگریٹوں کی راکھ تھی۔ جس کی چھاتی سے چمٹی ہوئی جونک اس کا رہا سہا خون پی رہی تھی اور جن کے مکان کے دروازے اور کھڑکیوں کے پٹ لوگ اکھاڑ کر لے گئے تھے۔ میں ابھی تک کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا۔ ایسی کوئی اختر میری زندگی میں نہیں آئی۔ جس اختر کا خیال مجھے اس وقت آ رہا ہے اور جو میری زندگی کے افق پر یہاں سے لے کر وہاں تک چھائی ہوئی ہے اور جسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا' اس کی آنکھوں میں نمود سحر کی نرمل تازگی تھی اور ان کے گھر کے آنگن میں شہتوت کا پیڑ تھا۔ بہار کے دنوں میں ننگے پیڑ کی شاخیں ہرے ہرے چکنے پتوں سے ڈھک جاتیں اور ان کے درمیان لال لال' قرمزی اور شربتی رنگ کے شہتوت آویزوں کی مانند لٹکنے لگتے۔ اسی پیڑ کے نیچے اختر اپنی کم سن سہیلیوں کے ساتھ گیند کھیلا کرتی تھی۔

پہلا پہلا پا کے

میں بیٹھی پیٹر اڈاوہ کے

ویردی میں جنج چڑھائی

سچا چوڑا پا کے

میں ان کے بیچ میں کود کر گیند چھین کے بھاگ جاتا۔ اختر شور مچاتی میرے پیچھے پیچھے آتی۔ میں ریلوے لائن عبور کر کے کھائی پھاند جاتا۔ اختر وہیں کھڑی پتھر اٹھا اٹھا کر میری طرف پھینکنے لگتی۔

"آخر جاؤ گے کہاں؟ میں ابھی جاتی ہوں خالہ کے پاس۔ مرن جوگا۔"

وہ میری امی کو خالہ کہا کرتی تھی۔ عمر میں اگرچہ وہ مجھ سے دو ایک سال بڑی تھی لیکن میرا قد اس سے بڑا تھا۔ چانچہ میں اس پر اپنا رعب جمایا کرتا۔ ہماری چھوٹی سی گلی میں ان کا مکان ہمارے گھر کے بالکل سامنے واقع تھا۔ ان دونوں گھرانوں کا آپس میں بڑا سلوک تھا۔ ہمارا بھی آپس میں بڑا سلوک تھا۔ شہتوت کے پیڑ پر پھل آتا تو میں بندر ایسی پھرتی کے ساتھ اس پر چڑھ جاتا اور زور زور سے ٹہنیاں جھاڑنے لگتا۔ اختر نیچے گھوم پھر کر جھولی میں گرے پڑے شہتوت جمع کرتی جاتی۔ پھر ہم وہیں شہتوت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھ جاتے اور اپنا اپنا حصہ بانٹنے لگتے کسی وقت اختر منہ پھلا کر جھولی پھیلا دیتی۔

"جاؤ میں نہیں لیتی"

"کیوں؟" میں غصے میں آ کر پوچھتا۔

اور اختر بڑبڑاتے ہوئے کہتی۔

تم نے پکے پکے خود کیوں رکھ لیے ہیں؟

میں ہنس پڑتا اور جھولی میں سے کئی ایک لال لال شہتوت نکال کر اسے دے ڈالتا۔ اختر خوش ہو جاتی مگر میری جھولی پر نظریں جمائے رکھتی۔

تم نظر لگا رہی ہو؟ ایں؟ میں تجھے بھی کھا جاؤں گا' سمجھیں؟

اور سورج مغرب کی سمت باغات کے جھنڈوں میں ڈوب جاتا اور درختوں کے گھنے چھتاروں میں چڑیوں کی چہکاریں گونج اٹھتیں۔ کھیتوں اور میدانوں پر شام کے ٹھنڈے سایوں کا غبار سا پھیل جاتا۔ ریلوے لائن کے پار ایک باغ تھا' ناشپاتیوں کا باغ۔ برسات کے دنوں میں باغ کی کھدائی ہوتی تو رات کے سمے اس طرف سے مچھروں کی یلغار اور گیلی مٹی کی بو آیا کرتی۔ صبح اسکول

جاتے ہوئے ہم باغ میں پہنچ کر پیڑوں کے گرد گھوم گھوم کر جڑوں کے پاس اگی ہوئی کھمبیاں چنا کرتے۔ اختر کو یہ سفید سفید تنی ہوئی چھتریاں بڑی پسند تھیں۔

''میں اپنی گڑیا کو بیاہ میں ایسی ہی چھتری دوں گی۔''

وہ کبھی ننھی منی انگلیوں میں پکڑ کر بڑے بھولپن سے منہ اوپر اٹھا کر کہتی اور اس کی بے داغ، دھلی دھلائی آنکھوں میں موم بتیاں سی ٹمٹمانے لگتیں۔ وہ بھولا بھولا مکھڑا بہار کا پہلا پھول تھا جو گجردم نور کے دھندلکے میں شبنم کی پھوار میں نہا رہا ہو۔

اونہہ۔ تمہاری گڑیا تو کانی ہے' بھلا اسے کون بیاہے گا؟

کون کہتا ہے وہ کانی ہے؟

اختر بلی کی طرح غراتی اور میں اسے چوٹی سے پکڑ لیتا اور دھونس جما کر کہتا۔

ہاں وہ کانی ہے' لنگڑی ہے' گنجی ہے۔

میں جو کہتا ہوں۔

اور اختر رو پڑتی۔ بیوقوف لڑکی!

پت جھڑ کے اداس دنوں میں درختوں پر سے زرد زرد پتے ایک ایک کر کے جھڑنے لگتے اور دیکھتے دیکھتے زمین پر بسنتی رنگ کی چادر سی بچھ جاتی۔ پھر درختوں کی چھاؤں غائب ہو جاتی اور ہر شے پر ایک بے رنگ مگر دلگداز اور من کو موہ لینے والی اداسی چھا جاتی۔ سوکھی پتیوں پر کوئی گزرتا تو ان کی شکستہ صدا پروں کی آواز کا گمان ہوتا۔ اس باغ میں ایک طرف اصلی گلاب کی پھلواڑی تھی۔ گلاب کی سوکھی ٹہنیوں کا رنگ بہار میں ان کے گرد منڈلانے والے بھونروں ایسا کالا پڑ جاتا۔ دوسری جانب کھیت کے تختے میں آلوچے اور آڑو کے پودے تھے۔ مالی دن بھر ان کی کانٹ چھانٹ میں مصروف رہتے۔ ہمارا اسکول کو جانے والا راستہ ان دونوں باغات کے بیچ سے ہو کر گزرتا تھا۔ یہ راستہ ایک نازک سی پگ ڈنڈی تھی جس پر شروع سے لے کر آخر تک لیموں اور کھٹے کے درختوں کا خوشبودار سایہ تھا۔ خزاں کی رت نکلتے ہی بہار کا جادو بیدار ہوتا تو ان پیڑوں پر سرسبز پتیوں کی شاداب ہریاول پھیل جاتی اور جابجا ننھی ننھی سفید کلیاں پلکیں جھپکاتی دکھائی دینے لگتیں اور سارا راستہ ان کی بھینی بھینی ترش مہک میں بس جاتا۔ اسکول سے واپسی پر جب ہم بستے لٹکائے وہاں سے گزرتے تو محسوس ہوتا گویا ہم خوشبو کے گھونٹ پی رہے ہیں۔ جب کلیاں پھوٹ کر شگوفے بن چکتیں تو ہوا کے جھونکے ان کی مخملیں پتیوں کو بکھیرنے لگتے۔ آلوچے کی چھریری اور اوپر کو اٹھی ہوئی لمبی ٹہنیاں سفید' کاسنی اور ہلکے ہلکے پھولوں سے ڈھک

جاتیں۔ اصلی گلاب کے کٹورے پورے کھل کر بھونروں کی ٹولیوں میں گھر جاتے۔ ناشپاتی کے پیڑوں کی نازک ٹہنیاں دودھیا پھولوں کو گود میں لیے ہوا میں جھولا کرتیں۔ کسی وقت ہوا تیز ہو جاتی تو پھول شاخوں سے ٹوٹ کر نیچے گرنا شروع ہو جاتے۔ ہم ان پھولوں سے اپنی جیبیں بھر لیتے اور گھر جا کر ان کے چھوٹے چھوٹے ہار پرونے لگتے۔ اختر اپنی چھوٹی سی پٹاری جو الم غلم چیزوں سے بھری رہتی تھی اٹھا کر آنگن میں لے آتی اور ہم بوڑھے شہتوت کی چھاؤں میں گڈی گڈے کا بیاہ رچاتے۔ اختر کی گڈی ویسے بھی اتنی خوبصورت نہیں تھی لیکن میں نے پنسل چبھو کر اس کی داہنی آنکھ کانی کر دی تھی۔ چنانچہ اس بیچاری کو مجبوراً گڈی کی آنکھوں پر دو پیسے والی عینک چڑھانی پڑی تھی۔ بیاہ کے بعد جب گڈا اپنے گھر اور گڈی واپس اختر کی پٹاری میں چلی جاتی تو وہ میری ہتھیلی پر اپنی ننھی سی انگلی ٹکا کر مجھے کہتی۔

طوطیا من موطیا تو ایس گلی نہ جا

ایس گلی دے جٹ برے لیندے پھائیاں پا

میں کہتا۔

”میں اس گلی میں کبھی نہ جاؤں گا“

اختر معصومیت سے پوچھتی۔

”کونسی گلی میں؟“

”جہاں جاٹ رہتے ہیں اور طوطوں کو قید کر لیتے ہیں“

اختر کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

ارے واہ تم کوئی طوطے ہو گیا؟

پھر کیا ہوں؟

”پھر“ اختر ذرا رک کر اپنے کمسن دماغ پر زور ڈالتی اور ذرا پرے کھسکتے ہوئے اتنا کہہ کر تیزی سے بھاگ اٹھتی۔

تم لنگور ہو۔

میں ہتھیلی کھلی چھوڑے پہلے تو ہکا بکا سا رہ جاتا اور پھر لپک کر اس کے پیچھے ہو لیتا۔ شہتوت کا بوڑھا پیڑ ہماری بچپن کی یہ چہلیں دیکھ کر جانے کیا سوچتا ہوگا۔ کیا درخت بھی سوچتے ہیں؟ لیکن وہ دیکھتے ضرور ہیں۔ کھلے آنگن کے ساتھی۔ شہتوت کے اس پیڑ کو خوب

یاد ہوگا جب اختر مجھے لنگور کہہ کر بھاگ گئی تھی تو میری ہتھیلی کھلی تھی اور میرے ہاتھ اس وقت بھی کھلے تھے جب اختر کو ڈولی میں بٹھلا کر کسی اجنبی کے ساتھ رخصت کر دیا گیا تھا اور پھر کسی نے اتنے پیار سے اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں جھک کر لال لال شرتی شہتوت سے اپنی جھولیاں نہیں بھری تھیں اور کسی معصوم روح نے اپنے ساتھی کی ہتھیلی پر انگلی لگا کر نہ کہا تھا۔

''طوطیا من موطیا.......''

ہمارے اسکول کے پچھواڑے بہت بڑا قبرستان تھا۔ وہاں شیشم' جامن اور بلوط کے جھنڈ اس قدر گھنے تھے کہ ہم دن کو وہاں جاتے ہوئے گھبرایا کرتے تھے۔ درختوں کے گہرے سائے دیکھ کر ہمیں دوری سے یوں دکھائی دیا کرتا گویا مردے اپنی قبروں سے نکل کر اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ کب کوئی بچہ اس طرف سے گزرے اور وہ اسے دبوچ کر اپنے ساتھ قبر میں لے جائیں۔ قبرستان کے دروازے پر کسی پیر صاحب کا مزار تھا۔ سفید قبر چبوترے پر بغیر چھت کے تھی مگر اوپر پیپل کا سایہ تھا۔ اور پیپل کے درخت کی سب سے اوپر والی شاخ کے ساتھ سبز رنگ کا جھنڈا لہرایا کرتا تھا۔ مزار ایک تکیے میں تھا جس کے چاروں طرف املتاس اور سریں کے درخت کھڑے تھے۔ بہار میں' املتاس کے درختوں میں بسنتی رنگ کے پھول' انگور کے خوشوں کی طرح جا بجا لٹکنے لگتے اور سریں کی گنجان ٹہنیاں ہلکے سبز رنگ کی جھالیں' پھولوں سے بھر جاتیں۔ یہ پھول خرگوش کے بالوں سے بھی زیادہ ملائم ہوتے اور قریب سے گزرتے ہوئے بے حد میٹھی خوشبو کی لپیٹیں آیا کرتی تھیں۔ مزار اور تکیے کے درمیان ایک اکھاڑہ تھا جہاں پہلوان کشتی لڑا کرتے تھے۔ آدھی چھٹی کے وقت میں اور اختر' مزار کے خاردار جنگلے کے قریب کھڑے دل بہار چوستے ہوئے پہلوانوں کو گتھم گتھا ہوتے دیکھا کرتے۔ مجھے یاد ہے ایک روز اختر نے کہا تھا۔

''تم بھی وہاں جا کر لڑو''

میں نے بڑے فخر سے گردن اوپر اٹھا کر جواب دیا تھا۔

میں کوئی پہلوان ہوں۔ میں تو بڑا ہو کر بابو بنوں گا۔

اور جب میں بڑا ہو کر بابو بنا تو اختر کا مہندی لگا نازک ہاتھ ایک فوجی ٹھیکیدار کے بھدے ہاتھ میں دے دیا گیا اور میں بے زبان بابو۔ گدھا بنا سب کچھ دیکھتا رہا اور خاموش رہا۔ کاش میں بستہ کھائی میں پھینک کر اس وقت اکھاڑے میں کود گیا ہوتا پھر شاید اختر اس قدر آسانی سے مجھ سے الگ نہ کر لی جاتی۔ پھر اختر کو مجھ سے چھیننا ایک طوفان کو دعوت دینا ہوتا۔ کاش میں نے ''شہنشاہ سلامت رہے یا الٰہی'' کے ساتھ ساتھ اکھاڑہ سلامت رہے یا الٰہی کا سبق بھی پڑھا ہوتا!

اسکول سے چھٹی ملتے ہی گھر کی راہ لیتے۔ پڑھائی سے ہمیں ذرہ بھر لگاؤ نہ تھا۔ کیونکہ ہمارا گنجا ماسٹر بات بات پر ہمارے کان مروڑا کرتا تھا۔ واپسی پر ہمیں ریل کا پھاٹک اکثر اوقات بند ملتا۔ ہم آہنی پھاٹک کے سفید جنگلے پر چڑھ کر ہرے رنگ کی ریل گاڑی کا تماشا کیا کرتے تھے۔ گاڑی پھاٹک کے قریب پہنچتی تو زمین تھرتھرانے لگتی اور جنگلا ہلنے لگ جاتا۔ گاڑی شور مچاتی' چیختی' چلاتی' گرداڑاتی' دھوئیں کے بادل چھوڑتی ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزر جاتی اور ہم کھڑکیوں میں صرف ٹوپیاں اور پگڑیاں ہی دیکھ سکتے۔

''یہ گاڑی کلکتے سے آئی ہے' کلکتہ بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں رات کو آتشبازی چھوٹا کرتی ہے۔''

ہم عموماً کلکتے کی باتیں کرتے ہوئے ریل کے پھاٹک سے گھر تک کا راستہ عبور کرتے۔ اختر کا باپ کلکتے میں کشمیری شالوں کے رنگنے اور بیچنے کا کام کرتا تھا۔ وہ کلکتے کا ذکر اس قدر بے تکلفی سے کرتی گویا اپنے گھر کی باتیں کر رہی ہو۔ اس وقت میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلکا ہلکا سا محسوس کرنے لگتا۔ چنانچہ مجھے کلکتے کے نام سے چڑ سی ہو گئی تھی۔

''اونہہ! کلکتے میں کیا رکھا ہے بھلا؟ میں تو بڑا ہو کر لاہور میں ہی رہوں گا۔ میں ایک بار لاہور گیا تھا۔ وہاں بڑے بڑے مکان ہیں اور ہاں۔ وہاں ایک دریا بھی ہے جس پر پل بنا ہے۔ کلکتے میں تو کوئی دریا نہیں' دریا کیوں۔ وہاں سمندر جو ہے' سمندر؟ میں منہ بنا کر پوچھتا۔ وہاں تیرے باپ نے سمندر بنایا ہے۔

سمندر تو نہیں لیکن اختر کے باپ نے وہاں گھر ضرور بنا لیا تھا سال میں صرف ایک مرتبہ وہ اپنے بال بچوں کے پاس آتا اور ایک آدھ ماہ رہ کر پھر واپس چلا جاتا۔ اس کی آمد کی اطلاع اختر مجھے ایک ہفتہ پہلے ہی دے دیتی تھی۔ پھر ایک روز اس کا تانگہ گلی کے سرے پر نمودار ہوتا۔ تانگے میں اسباب لدا ہوتا۔ اختر کے باپ کی ڈاڑھی اور کپڑوں پر انجن کے دھوئیں کی کالک جمی ہوتی اور وہ گلی میں ہر گزرنے والے سے ہاتھ ملاتے ہوئے گھر کی طرف چلا آ رہا ہوتا۔ دوسرے دن اختر اسکول سے چھٹی کرتی اور ظاہر ہے کہ میں بھی چھٹی مناتا۔ ہم دونوں ناخوں کے باغ میں جا کر کسی سایہ دار جگہ بیٹھ جاتے۔ اختر جیب سے سوہن حلوہ یا کھٹی میٹھی گولیاں نکال لیتی اور ہم مزے لے لے کر انہیں چوستے۔ اختر کو سوہن حلوہ بہت پسند تھا چنانچہ اس کا باپ کلکتے سے سوہن حلوہ لانا کبھی نہ بھولتا تھا۔ لیکن مجھے اس کا دانتوں کے ساتھ چپک جانا بہت برا لگتا تھا۔ اور میں اکثر اپنے حصے کا سوہن حلوہ بھی اختر کی جھولی میں ڈال دیتا تھا' لیکن اس کے عوض اس سے گولیاں لینا نہ بھولتا تھا۔ اگر وہ موسم بہار کا ہوتا تو گلاب کے احمریں کٹوروں اور ناشپاتی کے شگوفوں کے چکر کاٹنے والی شہد کی مکھیاں ہمارے سروں پر بھی گھومنے لگتیں۔ اور اگر شاخوں میں سرسبز کچی ناخیں لٹک رہی ہوتیں تو پیڑوں میں ہرے ہرے

طوطے ٹیں ٹیں کرنے لگتے۔ جیسے ہم سے سوہن حلوہ اور کھٹی میٹھی گولیاں مانگ رہے ہوں۔ اختر کی موٹی ماں بھی طوطے کی طرح ٹیں ٹیں کیا کرتی تھی۔ مگر اسے سوہن حلوہ اور کھٹی میٹھی گولیوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اس کا محبوب مشغلہ محلے داروں کی خدمت کرنا تھا' ضرورت مندوں کو سود در سود پر روپیہ دینا تھا۔ جس وقت بھی کوئی عورت اس کے گھر آ کر اپنی دکھ بیتی بیان کرتی تو اس کا دل رونے لگتا۔ وہ فوراً ٹرنک سے نوٹ نکال کر اسے تھما دیتی اور کھاتے میں اس کا نام لکھ لیتی۔ چند ہی مہینوں کے اندر اندر اس رقم کا سود پھیل کر اصل زر سے دوگنا ہو جاتا۔ اور جب وہ عورت اپنا قرضہ چکانے لگتی تو اسے محسوس ہوتا گویا اصلی رقم سود تھی اور اصل زر اس رقم کا بیاج ہے۔ محلے کی ہر عورت اختر کی ماں کی مقروض تھی۔ اور تقریباً ہر عورت کا رنگ پیلا تھا۔ مگر اختر کی ماں کے گال قندھاری انار ایسے تھے اور اس کی آواز اصیل مرغ کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔ ان کے مکان کے دیوان خانے میں عموماً عورتوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور اختر کی موٹی ماں ان کے درمیان قالین پر پھسکڑا مارے تیز تیز باتیں کرتی رہتی تھی یا کھاتے میں عورتوں کے انگوٹھے لگواتی رہتی۔ اس کے ایک قریبی رشتے دار کا لڑکا کمیٹی کے دفتر میں پانی کے بل وصول کرنے پر ملازم تھا۔ لمبے قد کا یہ دبلا سا لڑکا ہر دم بن سنور کر رہا کرتا اور گلی میں سے گزرتے ہوئے بار بار پیشانی پر آئے ہوئے بالوں کے چھلوں کو ہاتھ سے پیچھے کیا کرتا تھا۔ وہ محلے کے چوہدری کی لڑکی فہمیدہ پر بری طرح فدا تھا۔ اس کا بھید اس وقت کھلا جب ایک روز اس نے میری جیب میں ایک عدد رقعہ ڈال کر ایک میری ہتھیلی پر تھمائی اور سرگوشی میں بولا۔

جاؤ یہ خط فہمیدہ کو دے آؤ۔ مگر ذرا ہوشیار رہنا۔

اس واقعہ کے ٹھیک تیرہ سال بعد جب میں نے سردیوں کی ایک پر اسرار شام کے دھندلکے میں اختر کے نام ایک محبت بھرا رقعہ لکھ کر کسی بچے کی جیب میں ڈالا تو مجھے ایکا ایکی کمیٹی کے اس بل کلرک کا خیال آ گیا جس نے محلے کے چوہدری کی بیٹی فہمیدہ کے نام لکھا ہوا رقعہ میری جیب میں ڈالا تھا اور جس کے اب اپنی تین لڑکیاں تھیں اور جس کی کمر جھک رہی تھی اور کنپٹیوں کے بال سفید ہو رہے تھے اور کوٹ کا کالر ہمیشہ میل سے بھرا ہوا رہتا تھا اور جس کی رفتار میں اترے ہوئے دریا ایسی بیچارگی تھی۔ وقت کی چکی چل رہی تھی اور لمحات گیہوں کے دانوں کی طرح پسے جا رہے تھے اور بیچارہ انسان خاموش تھا اور چکی میں سے سفید گرد اڑ کر اس کے چہرے پر جم رہی تھی اور اس کے نقش دھندلا رہے تھے' بالوں کی رنگت بدل رہی تھی اور زندگی اسے پیچھے چھوڑ کر آگے نکلی جا رہی تھی۔ کہاں چلے گئے' کہاں گم ہو گئے وہ لمحات جب بہار کا درخشاں سورج نیلے آکاش کے وسط میں چمک رہا تھا! جب شبنمی ہوا کا جھونکا پوشیدہ جزیروں میں کھلنے والے پھولوں کی نرالی مہک سے گرانبار ہوا کرتا تھا' جب ہر بول ایک گیت تھا' ہر گیت ایک کہانی اور کہانی ایک

خواب۔ مہکتا اور جگمگاتا ہوا خواب! وہ قوس قزح کیا ہوئی جو کبھی تیرے افق پر سات رنگی کمان بن کر تن گئی تھی؟ ٹوٹ گئی' ٹوٹ گئی۔ رنگوں کے دیپ بجھ گئے' بہار کا درخشاں سورج خزاں کے افق میں بے جان پتے کی مانند ڈوب گیا۔ سورج پھر طلوع ہو گا مگر وہ چمکیلے ایام لوٹ کر نہ آئیں گے' بہار پھر آئے گی لیکن وہ پھول واپس نہ آ سکیں گے جنہیں خزاں کی دیوی اپنے ساتھ لے گئی۔

آؤ یہ خط فہمیدہ کو دے آؤ

جاؤ یہ خط رضیہ کو دے آؤ

جاؤ یہ خط اختر کو دے آؤ

کبھی فہمیدہ' کبھی رضیہ' کبھی اختر۔ نام بدلتے رہیں گے خط بدلتے رہیں گے' لیکن طوطے بولتے رہیں گے۔ ٹیں ٹیں' میرے پیارے طوطے تم اس گلی میں نہ جانا جہاں کے لوگ ظالم ہیں اور جو آزاد پنچھیوں کو پنجروں میں بند کر لیتے ہیں۔

طوطے بولتے رہے اور وقت گزرتا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہم بھی آگے بڑھتے گئے اور اب مجھے معلوم ہوا کہ کلکتے میں بھی ایک دریا ہے' جس کا نام ہگلی ہے اور پنجاب میں شہتوت اور ناشپاتی کے علاوہ اور بھی درخت ہیں جنہیں کبھی پھل نہیں لگتا' جن تک بہار کا سندیسہ کبھی نہیں پہنچتا اور لاہور میں دریائے راوی کے علاوہ ایک یونیورسٹی بھی ہے اور اس یونیورسٹی کے علاوہ ایک چڑیا گھر بھی ہے۔ اب ہم بڑے ہو گئے تھے۔ اب ہماری آنکھیں کھل گئی تھیں اور آنکھیں کھولتے ہی میں نے دیکھا کہ شہتوت کے پیڑ تلے گیند کھیلنے والی میلی کچیلی اختر کے بال جو کبھی جوگن کی جٹاؤں ایسے تھے۔ اب ریشم ایسے نرم اور ملائم ہیں اور ایک ریشمی آبشار کی مانند اس کی پشت پر گرے ہوئے ایڑیوں کو چھو رہے ہیں۔ اس کے دانت جو نیلی پنسل منہ میں ڈالنے سے گندے رہا کرتے تھے اب دودھ کی طرح سفید ہیں اور اس کے ہونٹوں کے داہنے کنارے کے پاس چھوٹا سا کالا تل' جسے ہٹا ڈالنے کی میں نے بچپن میں کئی بار کوشش کی تھی اب اس کے چہرے' اس کی خوبصورتی کا جزو ہے اور اسے میں کبھی نہیں ہٹا سکتا' اس کی سود خور ماں کا کاروبار بھی محلے سے نکل کر شہر میں پھیل گیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ موٹی ہو گئی تھی اور چہرے کی سرخ رنگت سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی اور اس کے پاس بیٹھنے سے جلے ہوئے دودھ ایسی بو آتی تھی۔ اختر کا مکان اب بھی ہمارے مکان کے سامنے تھا مگر اب وہ میرے سامنے بہت کم آتی تھی۔ وہ برقع اوڑھ کر گھر سے باہر قدم رکھتی۔ وہ تعلیم ختم کر کے کھانا پکانا سیکھ رہی تھی اور میں پڑھ لکھ کر کلرکی کر رہا تھا۔ وقت نے ہمارے درمیان ایک دیوار سی کھڑی کر دی تھی اور ہم اس دیوار کی اوٹ سے ایک دوسرے کو جھانکا کرتے تھے۔ اس کی ماں کبھی کبھار مجھے حساب کتاب کے لیے گھر بلاتی تو میں چور آنکھوں سے دیکھا کرتا کہ اختر نلکے کے پاس بیٹھی کپڑے دھو رہی ہے۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا ہے اور

جب وہ گیلے کپڑوں کو نچوڑنے کے لیے بالٹی سے باہر نکالتی ہے تو کن اکھیوں سے مجھے بھی دیکھ لیتی ہے۔اس کی نظریں پر گرم اور پر محبت ہیں اور مہربان بازوؤں کی طرح مجھے اپنے حلقے میں لے رہی ہیں۔اس کی ماں مجھ سے حساب لکھوا رہی ہے۔

چارسو انچاس اصل زر اور شرح فیصد پچیس روپے، باقی کیا بچا؟ یاد رہے ایک سو باسٹھ روپے پہلے جمع ہیں۔

ہاں ہاں، یہ تو سمپل انٹرسٹ کا سوال ہے۔

مگر میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا کیونکہ میرا انٹرسٹ غسل خانے میں کپڑے دھو رہا ہے۔اور اب وہ میرے قریب ہی کھڑا آئینے کے سامنے بال بنا رہا ہے۔اس کے لمبے بال شاہی جھول کی طرح پیچھے لٹک رہے ہیں۔اس نے ساٹن کی سفید شلوار کے ساتھ بسنتی وِیل کی قمیض زیب تن کر رکھی ہے۔قمیض پر ہلکے کتھئی رنگ کے بڑے بڑے پھول بنے ہوئے ہیں۔کمرے میں تیل کی خوشگوار مہک اڑ رہی ہے اور اس کی ماں پوچھ رہی ہے۔

تو پھر ڈیڑھ سال میں بیاج کیا بنا؟

ڈیڑھ سال میں تو بیاج کافی بن جانا چاہیے۔کیوں اختر تمہارا کیا خیال ہے؟ اور اختر میری کھلی ہتھیلی پر اپنی نازک سی انگلی نکا کر کہہ رہی ہے۔

میرے پیارے طوطے اس گلی میں مت جانا۔

مگر طوطے شہر کی ہر سمت سے اس گلی میں اڑے چلے آ رہے ہیں اور اختر کی ماں کی زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے اور وہ جلدی جلدی طوطوں کے پر قینچ کر کے انہیں پنجروں میں بند کر رہی ہے اور پھر ڈیڑھ سال میں تو بیاج کتنا ہی بن جاتا ہے۔اختر دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہے اور میری طرف نرم نرم، پرسکون نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور مسکرا رہی ہے اور میں باہر نکلنے کے لیے جوتا تلاش کر رہا ہوں۔

اختر کسی وقت ہمارے ہاں آتی تو مجھے گھر کی ہر شے میں زندگی اور محبت کی لطیف دھڑکنوں کی صدا سنائی دیتی۔جس کمرے میں وہ آپا کے پاس بیٹھی زنانہ قمیضوں کے نت نئے نمونے، سویٹروں کو بنتی یا فلموں پر باتیں کر رہی ہوتی، کسی نہ کسی بہانے میں بھی وہاں پہنچ جاتا اور پھر دیر تک وہیں جما رہتا۔میں نہیں جانتا وہ کونسی آگ تھی جس کے شعلے ہمارے درمیان روشن ہو کر گھر کی ہر شے کو ایک نرالی سحر طراز چمک میں اجال دیتے تھے۔رنگ ونور کے اس سیلاب میں اختر نے میری محبت کا منہ چوما تھا اور میرے گلے میں نیلے ستاروں کے ہار ڈالے تھے اور شرمیلی نگاہوں سے مجھے تکتے ہوئے دھیرے سے کہا تھا۔یہ پھول کبھی نہ مرجھائیں گے۔اور وہ پھول

کبھی نہ مرجھائے۔میری یادوں کے جنگل میں آج بھی ان سدا بہار پھولوں کے کنج مہک رہے ہیں اور میرے ذہن کا افق ان سحر طراز ستاروں کے نور سے جگمگا رہا ہے۔یہ بہار کے پھول ہیں' خزاں کے پھول ہیں۔ان کی مہک میں پت جھڑ کی افسردگی اور بہار کی تازگی سو رہی ہے۔

اب ہم ایک دوسرے کو خط بھی لکھنے لگے تھے۔ان خطوط میں ہم کیا لکھا کرتے تھے؟ ٹھیک یاد نہیں۔ہاں اتنا ضرور علم ہے کہ ہمارا ہر خط کسی محبت بھرے شعر سے شروع ہو کر کسی ایسے ہی شعر پر ختم ہوا کرتا تھا۔اختر صبح صبح صفائی کی غرض سے گلی والے دیوان خانے میں اتر آتی اور میں خط جیب میں چھپائے اپنے گھر کے دروازے میں کھڑا رہتا۔جب وہ کھڑکی والی چق کو جنبش دیتی تو میں گلی میں آ جاتا اور قریب سے گزرتے ہوئے چق اٹھا کر خط اندر ڈال دیتا۔اختر کے گھر کے عقب میں ایک مسجد تھی۔دوسرے روز میں خط کا جواب لینے کے لیے اس مسجد میں نہانے چلا جاتا۔اختر اپنے مکان کے کوٹھے پر آ جاتی اور مجھے مسجد کے صحن میں ٹہلتا دیکھ کر جھٹ خط نیچے پھینک دیتی۔میں خط کو عموماً مسجد کے غسل خانے میں جا کر پڑھ لیا کرتا۔ایک دن میں خط اٹھا رہا تھا کہ حجرے میں سے امام مسجد نے دیکھ لیا۔اس نے مجھ سے تو کوئی بات نہ کی مگر اختر کے ماموں کو ایک ایک بات بتا دی۔اختر کا کرخت چہرے والا ماموں قالین دھونے کے علاوہ سٹے کا کام بھی کرتا تھا۔اس نے اور تو کچھ نہ کیا صرف اختر کو دوسرے ہی روز اس کے باپ کے پاس کلکتے پہنچا دیا۔مجھے بالکل خبر نہ ہوئی۔ایک ہفتے بعد مجھے دفتر کے پتہ پر اختر کا ایک خط ملا۔اس مختصر سے خط میں اس نے لکھا تھا۔

"ماموں نے مجھے مارا بھی تھا۔اسے سارا پتہ چل گیا ہے۔میں کلکتے میں ہر دم اداس رہتی ہوں۔میری چچی بھی آج کل یہیں ہے۔چچی زاد بہن ناہید کو میں نے اپنی رازدار بنا لیا ہے۔اول تو اس خط کا خدا کے لیے جواب نہ لکھنا اور اگر لکھو تو لڑکی بن کر اور ناہید کے نام۔خدا کے لیے بدگمانی نہ کرنا میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔اختر آج بھی تمہاری ہے اور کل بھی تمہاری رہے گی۔

میں نے لڑکی بن کر اختر کو خط لکھنا مناسب خیال نہ کیا اور تنخواہ ملتے ہی ہوڑا ایکسپریس میں سوار ہو کر کلکتہ جا پہنچا۔گھر میں یہ بہانہ بنایا کہ اپنے ایک دوست کی شادی میں شریک ہونے جا رہا ہوں۔متواتر دو روز میں دھرم تلہ سے زکریا سٹریٹ کے چکر لگاتا رہا مگر اختر کی چچی کے گھر جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔تیسرے دن تنگ آ کر میں نے 'محمودہ' کے فرضی سے نام سے اختر کی چچی زاد بہن ناہید کو خط لکھا کہ میں دو ایک روز کے لیے کانپور سے یہاں آئی ہوں اور مجھے کل شام آ کر مل جاؤ۔اختر میرا خط فوراً پہچان گئی۔میں نے اپنے ایک دوست کے مکان کا پتہ دیا تھا۔دوسرے دن تیسرے پہر اختر ناہید کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔وہ مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی اور جب شام کو ہم ایک سینما گھر میں بیٹھے فلم دیکھ رہے تھے تو اختر نے میرا ہاتھ اپنی گرم ہتھیلی میں تھامتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

ہائے میں بدنام تو نہ ہوں گی؟

اختر کی آواز پژمردہ اور غم آلود تھی۔ فلم کی دھیمی چمک میں اس کی بھیگی بھیگی سیاہ آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ میں نے کہا۔

میں کل جا رہا ہوں؟

کہاں؟

واپس

اختر کچھ پریشان سی ہوگئی۔ وہ بار بار آنکھیں جھپکا رہی تھی۔ اس نے ہونٹوں کی پتیوں پر زبان کی نوک پھیرتے ہوئے کہا۔

میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔

میں نہیں جانتا اختر کا مطلب کیا تھا۔ لیکن میرا مطلب اسے ساتھ لے کر کلکتہ کے سینماؤں' باغوں اور ریستورانوں میں یونہی بے مقصد گھومنا نہیں تھا۔ میں اسے دیکھنا چاہتا تھا' اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ وہ سر شام گھروں کو لوٹتے ہوئے چرواہوں کے گیت تھے یا یوکلپٹس کے جنگلوں میں اگنے والے خودرو پھول۔ دیکھ لیے تھے اور ان کی آواز میرے دل میں اتر گئی تھی اور ان کی مہک میرے ذہن میں رچ گئی تھی۔ دوسرے روز میں کلکتے سے واپس چل پڑا۔

پورے تین ماہ بعد اختر کلکتے سے لوٹی تو اپریل ختم ہو رہا تھا۔

شام کے جھٹپٹے میں ان کا تانگہ گلی کے سرے پر آن کھڑا ہوا میں بازار میں پان والے کی دوکان کے اندر بیٹھا شطرنج کھیل رہا تھا۔ میں نے اختر کو نیچے اترتے دیکھا۔ اس نے سیاہ برقع اوڑھ رکھا تھا اور ناہید کے ساتھ وہ اپنی مخصوص چال چلتی گھر کی سمت چل پڑی اور میں شطرنج پر چال چلتے چلتے بھول گیا۔ دوسرے روز ایک چھوٹی سی بچی نے مجھے ایک خط دیا۔

طوطیا من موطیا۔ میں کلکتے سے آگئی ہوں۔ تم نے تو بھول کر بھی یاد نہیں کیا۔ سچ مرد بڑے بے وفا ہوتے ہیں۔ میں تمہارے لیے ایک خاص چیز لائی ہوں۔ کہاں دوں؟ کیسے دوں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ماموں مجھ سے بالکل کلام نہیں کرتا۔ میری بھی جوتی بولتی ہے اس سے۔

آخر ایک روز ہمیں موقع مل گیا۔ اختر بدھوار کو زنانہ شو دیکھنے کا بہانہ بنا کر ناہید کے ساتھ گھر سے باہر نکل آئی۔ میں پروگرام کے مطابق شہر کے مشرقی دروازے کے باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ناہید سینما دیکھنے چلی گئی اور ہم دونوں دوسری طرف روانہ ہو پڑے۔

''کہاں جائیں؟'' اختر نے پوچھا۔

''مجھے کیا پتہ۔ تم یہ بتاؤ وہ خاص چیز کیا ہے؟''

مجھے گتے کا نیلے رنگ کا چھوٹا سا ڈبہ نظر آ گیا تھا۔

''بے صبر کیوں ہو رہے ہو کہیں بیٹھ تو لینے دو''

مگر بیٹھیں کہاں؟ شہر کے بڑے باغ میں دیکھے جانے کا ڈر تھا' ہوٹل میں بیٹھنے کے لیے روپوں کی ضرورت تھی اور سڑکوں پر ہم گھوم نہیں سکتے تھے۔ تو پھر خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

''چلو قبرستان چلیں''

اختر فوراً مان گئی اور ہم قبرستان کی طرف چل پڑے۔ وہاں سے قبرستان جانے والا کچا راستہ کھیتوں کے درمیان سے ہو کر گزرتا تھا۔ ہمارے قدموں تلے گرد اڑ رہی تھی جو ہمارے جوتوں اور سروں پر جم رہی تھی۔ ارد گرد ہموار کھیتوں میں گیہوں کی بالیاں دھوپ میں مسکرا رہی تھیں۔ شیشم کے درختوں میں زرد زرد بور سا آ رہا تھا اور ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ جب ہم ریلوے لائن عبور کرنے لگے تو پھاٹک بند تھا اور گاڑی آ رہی تھی۔ ہمارے قریب ہی چری سے لدا ہوا چھکڑا کھڑا تھا اور بیلوں کی گردنوں پر سیاہ خون جما ہوا تھا اور بے شمار کھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور بیل سر جھکائے خاموشی سے جگالی کر رہے تھے۔ دفعتاً زمین تھرتھرانے لگی اور تھوڑی دیر بعد سبز رنگ کی گاڑی' شور مچاتی' گرد اڑاتی' دندناتی گزر گئی اور ہم صرف مسافروں کی ٹوپیاں اور پگڑیاں ہی دیکھ سکے۔

یہ گاڑی کلکتے سے آئی ہے۔ کلکتہ بہت بڑا شہر ہے اور وہاں رات کو آتشبازی چھوٹا کرتی ہے'

اختر اور میں کھلکھلا کر ہنس پڑے اور ہمارے پاس کھڑے ایک جھکی ہوئی کمر والے بوڑھے نے گردن گھما کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کی جھریوں پر لطیف سا تبسم نمودار ہوا۔ اس نے سر جھکا لیا اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ایک طرف چل پڑا۔ ریلوے لائن' افق کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ قبرستان کے دروازے پر پیر صاحب کا مزار بالکل ویسے ہی تھا۔ پیپل کی چوٹی پر سبز علم لہرا رہا تھا۔ صرف مزار والے چبوترے پر چند ایک قبروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ املتاس کی شاخوں میں زرد پھولوں کے فانوس لٹک رہے تھے اور پہلوان اکھاڑے کے باہر تیل مالش کر رہے تھے۔ قبرستان میں داخل ہونے کے بعد جب ہم ٹوٹی پھوٹی' شکستہ قبروں کے درمیان سے گزر رہے تھے تو ہمیں بڑی پر درد اداسی نے گھیر لیا تھا۔ دل میں خواہ مخواہ اس قسم کا خیال آ رہا تھا جیسے ہم کسی عزیز کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جا رہے ہیں۔ جامن اور شیشم کے درختوں تلے گھنی چھاؤں تھی۔ ایک جگہ بھیڑ کا بچہ تھوتھنی جھکائے گرے پڑے پتے چر رہا تھا اور میں اور اختر خاموش تھے۔ ہمارے خاموشی بلا ارادہ تھی۔ چلتے چلتے ہم قبرستان کے دوسرے کنارے تک پہنچ گئے۔ یہاں ایک

دبلی پتلی' بل کھاتی ندی تھی جس نے پھلدار باغات کو قبرستان سے الگ کیا ہوا تھا۔ ہم یہیں بیٹھ گئے۔ ہمارے سروں پر اونچا لمبا' مولسری کا درخت کا چھتر تھا اور پاس ہی ایک نئی بنی ہوئی قبر پر گلاب کے پھول مرجھا رہے تھے ندی کے دونوں جانب مرطوب کناروں پر مخملیں سبز دھوپ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی اور کہیں کہیں بھنگ کی جھاڑیاں بھی پانی میں اپنا عکس دیکھ رہی تھیں۔ مولسری کے پھول ہمارے آس پاس گرے ہوئے تھے۔ ہوا ان کی دھیمی دھیمی مہک سے بوجھل تھی۔ ندی کی دوسری جانب لوکاٹ کے درختوں پر زرد زرد لوکاٹوں کے گچھے لگ رہے تھے اور باغ کی خاموش فضا میں کبھی کبھی رکھوالے کی آواز لہرا جاتی تھی۔ مولسری کے چھتر کے اوپر گہرا نیلا آسمان مسکرا رہا تھا اور نیچے مخملیں دھوپ کے بازوؤں میں ٹھنڈے پانی کی ندی چمک رہی تھی اور میرے سامنے ایک تازہ قبر کے چبوترے پر اختر بیٹھی تھی۔

اب لاؤ وہ خاص چیز

اختر نے مسکراتے ہوئے برقعے کی جیب سے نیلا ڈبہ نکالا اور اسے کھول کر خاص چیز میرے آگے رکھ دی۔

یہ قبرستان میں مجھے سوہن حلوہ کھلانے لائی تھی اور جیسے کلکتے میں سوہن حلوے کے علاوہ اور کوئی شے نہیں ملتی۔

اور گرم شالیں بیچنے اور گرم شالیں رنگنے والے کشمیری ہاتو کی بے وقوف لڑکی! تجھے چاروں طرف محض سوہن حلوہ ہی نظر کیوں آتا ہے؟ میرا جی چاہا کہ ڈبہ ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو جاؤں اور چیخ چیخ کر فریاد کروں۔

اٹھو مردو! سوہن حلوہ کھاؤ۔

لیکن میں ڈر گیا کہیں وہ سچ مچ باہر ہی نہ نکل آئیں۔ میں نے سوہن حلوہ کھاتے ہوئے اختر سے کہا۔

ہاہا۔ بھئی یہ تو بڑا ہی لذیذ ہے مگر پیاری محبوبہ آج یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ تم واقعی گدھی ہو۔ گدھے ہو گے تم۔

''اچھا بابا میں بھی گدھا سہی مگر اب رونے دھونے سے کیا حاصل؟ بچے سب کے مرتے ہیں۔ ایک مر گیا ہے تو خدا اور دے دے گا۔''

اختر نے میری طرف چوری چوری دیکھا اور ہم بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور سامنے ندی کنارے بیٹھے ہوئے دو تین کوؤں نے گردنیں ٹیڑھی کر کے ہمیں غور سے گھورنا شروع کر دیا۔ جیسے سوچ رہے ہوں انسان قبرستان میں بھی قہقہے لگا سکتا ہے؟ میں نے اختر کو ڈرانے کے لیے کہا۔

جہاں تم بیٹھی ہو معلوم ہے نیچے کیا ہو رہا ہے؟

''کیا ہو رہا ہے؟'' اختر نے سہم کر پوچھا۔

''تمہیں آوازیں سنائی نہیں دے رہیں؟''

''نہیں تو'' اختر اور ڈر گئی۔

''اس قبر میں مردے کا فرشتوں کے ساتھ جھگڑا ہو رہا ہے۔ فرشتے حساب کتاب مانگ رہے ہیں اور مردہ کہہ رہا ہے اس کا حساب کتاب لیا جا چکا ہے اور وہ بار بار حساب نہیں دے سکتا''

اختر جلدی سے اٹھی اور ڈر کر میرے ساتھ آن لگی اور میں نے محسوس کیا اختر نے مولسری کے پھولوں کا لباس پہن رکھا ہے اس کا کہکشاں کی چادر میں لپٹا ہوا جسم شیریں مہک کی ایک غیر مرئی لہر ہے۔ اس کے ہونٹ سوہن حلوے سے زیادہ میٹھے ہیں اور سوہن حلوہ کلکتے کا بہترین تحفہ ہے۔ اٹھو مردو! سوہن حلوہ کھاؤ!

مگر قبریں خاموش تھیں۔ کتبوں کے کھنڈر چپ تھے۔ ان پر کندہ تحریریں منجمد چیخیں تھیں۔ سنگین' مرگ آلود' جاں بلب۔ نئی بنی ہوئی قبر پر گلاب کے پھول مرجھا رہے تھے اور جب ہوا کا تیز جھونکا درختوں کی شاخوں کو ہلاتا ہوا گزرتا تو مولسری کے پھول ہمارے سروں پر اور جھولیوں میں گرنے لگتے اور اختر کے سیاہ بال اس کی پیشانی سے کھیلنے لگتے۔ اختر نے آنکھوں پر آئی ہوئی زلف پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''تم اتنی جلدی کلکتے سے آ گئے اور مجھے اداسیوں نے گھیر لیا۔ سچ جب تم میرے پاس نہیں ہوتے تو میرا جی کسی کام میں نہیں لگتا۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ ایک دم سب کام چھوڑ چھاڑ کر وہیں چلی جاؤں جہاں تم ہو اور .... بس جہاں صرف تم ہو۔''

میں نے اختر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

اور جب تم میرے پاس نہیں ہوتیں تو میرا دل یہی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو کسی سخت ترین' مشکل ترین' پر مشقت کام میں لگا دوں اور جب تھکن اور شکستگی سے میرا بند بند دکھنے لگے اور جسم پسینے میں شرابور ہو جائے تو کسی جگہ' کسی بھی جگہ گر پڑوں اور گہری نیند میں کھو جاؤں''

اختر نے آنکھیں بند کر لیں۔ کنول کی نازک پلکیں آپس میں مل گئیں۔ کنول سو گیا تھا؟ میں نے سوچا اگر اختر سچ مچ سو گئی تو ناہید اکیلی گھر لوٹ جائے گی اور اختر کا بٹے باز ماموں اسے پھر کلکتے بھیج دے گا۔ میں نے اختر کی ناک کو انگلی سے چھو کر کہا۔

''تمہاری ناک تلوار کی دھار ہے اور مجھے ڈر ہے کہیں میری انگلی نہ کٹ جائے میری پیاری محبوبہ! اگر قبرستان میں نیند کا طاری ہو

جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

اختر جلدی سے اٹھ بیٹھی اور برقع درست کرنے لگی۔ وہ سرخ سینڈل کا فیتہ کستے ہوئے بولی۔

"وقت کیا ہوگا؟"

میں نے درختوں کی ڈھلتی چھاؤں کو دیکھ کر کہا۔

"سینما شو ختم ہونے والا ہوگا۔"

جب ہم سینما گھر کے باہر پہنچے تو شوکب کا ختم ہو چکا تھا اور بیچاری ناہید کھڑے کھڑے اکڑ گئی تھی۔

دوسری جنگ عظیم پورے زوروں پر تھی۔ برما اور آسام میں زبردست مدافعت کے باوجود جاپانی فوجیں برابر آگے بڑھتے چلی آ رہی تھیں۔ کلکتے سے اختر کے والد کے برابر خط آ رہے تھے کہ شہر میں خوف وہراس پھیل رہا ہے اور بیوپاری مال نہیں اٹھا رہے۔ اور پھر ایک روز عین دوپہر کے وقت جاپانی جہازوں نے اچانک کلکتے پر ہوائی حملہ کر دیا۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ تمام کاروباری واپس آ گئے۔ اختر کا باپ بھی اسی ریلے میں گھر پہنچ گیا۔ چند روز بے کار رہنے کے بعد اس نے فوج میں آلو سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لے لیا۔ باپ کی موجودگی کے باعث اختر اب محتاط ہو گئی تھی۔ وہ کوٹھے پر دن میں ایک آدھ پھیرا ضرور مارتی۔ مگر کھڑکی میں لگے رہنے کی بجائے ایک دوبار مسکرا کر نیچے اتر جاتی۔ اب اس کا زیادہ وقت دیوان خانے میں ماں کے ساتھ گزرنے لگا۔ ویسے ہماری خط وکتابت کسی نہ کسی طرح باقاعدہ شروع تھی۔ میرا یہ معمول تھا کہ صبح کی سیر سے واپسی پر گلاب کے دو تین پھول اپنے ساتھ لاتا اور دیوان خانے کے پاس سے گزرتے ہوئے چق اٹھا کر انہیں اندر ڈال دیتا۔ اختر وہاں صفائی وغیرہ کی غرض سے پہلے ہی موجود ہوتی تھی وہ پھول اٹھا لیتی اور بعد ازاں خط میں شکریہ لکھ کر بھیج دیتی۔ ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ میں نے کھڑکی کی چق اٹھا کر پھول اندر پھینکے تو وہاں اختر کی موٹی ماں بیٹھی حساب کتاب کی پرانی کاپیاں دیکھ رہی تھی۔ گلاب کے نازک پھول سود در سود کے کھاتوں میں جا گرے۔ اختر کی ماں ضرور چونک اٹھی ہوگی مگر میں کان لپیٹ کر اپنے مکان میں گھس چکا تھا۔ دن بھر میں دفتر میں بیٹھا اسی ادھیڑ بن میں مبتلا رہا کہ اب کیا ہوگا؟ ہوا یہ کہ بی بی صاحبہ نے میری امی کو کہلوا بھیجا میاں صاحبزادے کو راہ راست پر لایا جائے۔ امی مجھے اکیلے میں سمجھانے لگیں تو میں نے خدا کو حاضر وناظر جان کر کہا کہ اب میں راہ راست پر آ گیا ہوں اور اب چشم حقیقت کھل گئی۔ ہے آئندہ ایسی حرکت بالکل نہ ہوگی۔ مگر خدا جانے اختر کہاں گم ہو گئی تھی۔ چوتھے پانچویں روز جا کر کہیں اس کی مرجھائی سی شکل دیکھی۔ وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ ماتھے پر زرد رنگ کی پٹی بندھی تھی اور آنکھیں جیسے سوج رہی تھیں۔ اس نے مجھے دیکھا۔ آہستہ سے پیچھے ہٹی اور کھڑکی

بند کر دی۔ اسے کیا ہو گیا تھا؟ مجھ سے یہ بے رخی کیوں؟ میں اس معمے کو حل تو کر نہ سکا لیکن جوابی حملے کے طور پر میں بھی کھڑکی کی طرف پشت کئے کھڑا ہونے لگا اور کوئی خط لکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ دو ہفتے گزر گئے۔ ایک روز میں مسجد کے صحن میں ٹونٹیوں کے پاس بیٹھا مسواک کر رہا تھا کہ کسی نے میری پشت پر آم کی گٹھلی پھینکی۔ میں سمجھ گیا مگر چپکا ہو رہا۔ تھوری دیر بعد ایک اور گٹھلی میری پیٹھ پر لگی۔ میں مسواک پھینک تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے باہر نکل گیا۔ دوسرے روز وہیں بیٹھا مسواک کر رہا تھا کہ دھپ سے ایک پتھر مسجد کے صحن میں گرا۔ میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی جب مٹی کا لوٹا بیچ صحن میں آن گرا تو میں اوپر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اوپر کوٹھے کی منڈیر پر اختر ہنس رہی تھی۔ میں بھی ہنس پڑا۔ دوسرے روز عید تھی۔ میں نے اسے سوہن حلوہ بھیجا اور اس نے اپنے بالوں کی لٹ کاٹ کر بھیج دی۔ میں نرم نرم بالوں پر انگلی پھیر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کاش اختر کچھ اور بال بھیج دیتی اور میں سردیوں کے لیے ایک آدھ مفلر ہی بنا لیتا۔ شام کو وہ نیلے پیلے لال غبارے لے کر اپنے کوٹھے پر میری بہنوں کے ساتھ کھیلتی رہی۔ بعض غباروں میں گیس بھری ہوئی تھی۔ وہ انہیں کچھ دیر ہوا میں لہرانے کے بعد چھوڑ دیتی۔ غبارہ اوپر ہی اوپر اٹھنے لگتا۔ سب اسے مہربان دوست کی مانند ہاتھ ہلا ہلا کر رخصت کرتے۔ غبارہ دیکھتے دیکھتے آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں رنگین دھبہ سا بن کر رہ جاتا۔ اس رات اختر کے گھر آنگن والے شہتوت کے پیڑ تلے لڑکیوں نے مل جل کر ڈھولک بجائی اور خوب گیت گائے۔ ہمارے گھر کے تمام بچے اور عورتیں بھی وہیں تھیں۔ میں چھت پر لیٹا کتنی دیر تک ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ اختر کی آواز سنتا رہا۔

ادھی رات چڑھن کھیتاں

مجھے یاد ہے انہیں دنوں میں نے ایک افسانہ لکھا تھا جس میں اختر سے قبرستان والی ملاقات کا حال بیان کیا تھا۔ یہ افسانہ دہلی کے ایک رسالے میں لیکوریا کے اشتہار کے ساتھ چھپا۔ میں نے بڑے اشتیاق سے افسانے کے اوراق کاٹ کر اختر کو بھیجے۔ دوسرے روز اس نے کاغذ کے پرزے پر لکھ بھیجا۔

"پیارے طوطے! تم نے یہ کیا بکواس لکھی ہے؟ کیا یہ تم نے لکھی ہے؟ میں نے تم سے ایسی باتیں کب کہیں تھیں جو تم نے میرے نام منسوب کی ہیں۔ سچ مجھے تو افسانے میں اپنی باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آئیں۔ میں نے پڑھنے کے بعد افسانہ جلا دیا تھا اور ہاں تم نے کل میرا منہ کیوں چڑھایا تھا؟"

مجھے بے حد غصہ آیا لیکن یہ سوچ کر کہ آخر فوج میں آلو سپلائی کرنے والے کی لڑکی ہے، غصہ پی گیا۔ بیگم صاحبہ کو اپنے مکالمے پسند نہیں آئے۔ حالانکہ افسانے میں انہیں قلمبند کرتے ہوئے میں نے خاص طور پر اردو ڈکشنری سے مشورہ لیا تھا۔ مگر اس کے دماغ میں

تو سوہن حلوہ بھرا ہوا تھا۔ وہاں افسانے ایسی لطیف شے کا کیا گزر۔

ویسے اب ان کے ہاں میرا بھی کوئی خاص گزر نہیں تھا۔ اختر کی ماں اب حالات سے پوری طرح باخبر تھی اور اختر کا ہمارے ہاں آنا جانا بالکل بند ہو گیا تھا۔ مجھے اس سے ملے اور باتیں کئے کئی ماہ ہو چلے تھے۔ ایک روز اختر نے مجھے لکھ بھیجا کہ میں اسے رات کے بارہ بجے ان کے مکان کی ڈیوڑھی میں ملوں۔ طے یہ پایا کہ ملنے سے پیشتر ہم دونوں کو دیا سلائیاں جلا کر سگنل دینا ہوگا۔ چنانچہ دوسری رات جب شہر کے گھڑیال نے بارہ کا گجر بجایا تو اختر نے غسل خانے والی کھڑکی میں دیا سلائی جلائی۔ میں نے بھی سگنل کا جواب دیا سلائی جلا کر دیا اور اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں آ گیا۔ موسم سرما شروع ہو چکا تھا اور لوگ چھتوں کے نیچے سونے لگے تھے۔ گلی دور تک سنسان تھی اور کمیٹی کی بتیاں اپنی کمزور روشنی پھیلا رہی تھیں۔ اختر اپنے مکان کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اس نے گلی میں ادھر ادھر جھانک کر دیکھا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ لیکن میں نے جلدی سے ایک زقند بھری اور سامنے والے مکان کی ڈیوڑھی میں جا پہنچا۔ اختر نے فوراً مجھے تھام لیا۔

"یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں' اوپر چلتے ہیں"

ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اختر میرے آگے بلی کی مانند قدم اٹھا رہی تھی۔ دوسری منزل میں میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی بتی کم کی ہوئی تھی اور اس کی سمٹی ہوئی مدھم روشنی صرف میز تک ہی محدود تھی۔ ساتھ والے کمرے میں سے اختر کی ماں کے خراٹوں کی خوفناک آواز آ رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ڈری ہوئی بھینس کو کھینچ کھینچ کر زبردستی کھونٹے کے ساتھ باندھ رہا ہے۔ مجھے اپنے آپ پر چور کا گمان ہو رہا تھا۔ دل میں ہر دم' ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا تھا کہ اب کوئی نہ کوئی جاگ اٹھے گا اور ہم پکڑ لیے جائیں گے۔ کوٹھے کی چھت پر گلابی ٹھنڈک تھی اور آسمان کے نیلے قالین پر ستاروں کے جھرمٹ ٹمٹما رہے تھے۔ اختر دروازہ بند کرنے گئی تو میں نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر خدا سے دعا مانگی کہ ہماری پاکیزہ محبت کی رکھوالی کرے۔ اختر میرے پاس کھڑی تھی۔ اس نے کندھوں پر شال ڈال رکھی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ستاروں کی جوت کا دھیما عکس لرز رہا تھا اور پرسکون چہرے پر ہلکا نیلا نورانی غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ ہم چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ جس طرح پھول پھل' رات کی بے زبان خاموشی میں اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم ایک دوسرے کے قرب سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ محبت کی کوئی زبان نہیں اور وہ اس وقت ہمکلام ہوتی ہے جب ہم بولنا بند کر دیتے ہیں۔ ستارے اسی زبان میں درختوں اور پہاڑوں اور وادیوں پر اپنے سربستہ اسرار فاش کرتے ہیں اور پھول اسی بولی میں سورج کی نیم گرم کرنوں کا استقبال کرتے ہیں۔ ہماری خموشی کو بھی الفاظ کے نظر نہ

آنے والے سنہری پر لگ رہے تھے۔ میرے ہونٹ بند تھے مگر میں کہہ رہا تھا۔

اختر....... یہ راتوں کی مہارانی رات ہے۔ یہ شہر کی گلیوں اور باغوں پر امن و آسودگی کا پیام لے کر طلوع ہوئی ہے۔ ہر شے چپ ہے' ہر شے محوِ خواب ہے اور جب ہر شے محوِ خواب ہوتی ہے تو دلوں کے درد بیدار ہو جاتے ہیں اور مرغزاروں میں نئے نئے چشمے نمودار ہوتے ہیں اور صنوبر کے جھنڈوں میں چھپ کر بہنے والی ندیاں اپنی چال بھول جاتی ہیں۔

ہم خاموش تھے' ہم بول رہے تھے' یہ کیسی خموشی تھی؟ یہ کیسی گفتگو تھی؟ فطرت کس قدر پر اسرار ہے۔ آکاش پر موتیے کے پھول مسکرا رہے تھے۔ مکانوں کی چھتیں ہلکے اندھیرے' ہلکے اجالے میں عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ دور باغات کی طرف سے کسی پرندے کی دلگداز صدا آ رہی تھی۔ اس وقت معصوم کلیاں اپنی نازک پنکھڑیاں کھول رہی ہوں گی اور شبنم ان کی مخملیں سطح پر محبت کے پر درد گیت بکھیر رہی ہوگی۔ اختر نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور اپنا سر میرے سینے سے لگا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ محبت ہمیشہ روتی رہی ہے۔ میں نے اپنا منہ اس کے ریشمی بالوں کے جھرمٹ میں چھپا دیا اور مجھے وہ گیت یاد آ گیا جو عید کی رات کو اختر نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر گایا تھا۔ ادھی راتی چڑھن کھتیاں۔ آدھی رات بیت چکی تھی اور کھتیاں۔ ستاروں کا جھومر مشرقی آسمان کی پیشانی پر جھلملا رہا تھا۔ اختر کے آنسو میری قمیض میں جذب ہو رہے تھے اور ہمارے دل اپنی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر بادبانی بجروں کی طرح' دھند میں ڈوبے ہوئے میلے اور پر سکون سمندروں میں پہلو بہ پہلو چلے جا رہے تھے۔ یہ سفر کب ختم ہوگا/ یہ سفر کب شروع ہوا تھا؟

اچانک وہ دوسری منزل میں کسی نے لیمپ کی بتی اونچی کر دی اور چھت کے جنگلے میں سے روشنی کا پھیکا غبار سا اٹھنے لگا۔ اختر تڑپ کر مجھ سے الگ ہوئی اور جنگلے پر جھک کر نیچے جھانکنے لگی۔ کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

دھک' دھک' دھک....... چڑھنے والے کا ہر قدم ہمارے دل پر پڑ رہا تھا۔

''کہیں چھپ جاؤ'' اختر نے ہانپتے ہوئے کہا۔

مگر میں وہیں کھڑا رہا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اختر کے باپ کی بھاری آواز گونجی۔

وہ دروازے میں کھڑا ہمیں غضبناک نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ہم سہمے ہوئے تھے اور نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے منہ پر پوری طاقت سے طمانچہ مارا اور اختر کو ریت کی بوری کی

مانند گھسیٹتے ہوئے نیچے لے گیا۔ میں وہاں بت بنا کھڑا رہا۔ میری ایک آنکھ گرم ہو کر دُکھ سی رہی تھی۔ اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ اختر ابھی میرے سینے پر گال رکھے رو رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں کی نمی ابھی تک میری قمیض میں مہک رہی تھی۔ مکانوں کی چھتیں خاموش تھیں۔ ستاروں کے پھول اسی طرح جھلملا رہے تھے مگر ان بادبانی بجروں کا میلوں تک نشان نہیں مل رہا تھا جو نیلے سمندر کی دھند میں پہلو بہ پہلو سفر کر رہے تھے۔ دوسری منزل پر دبی ہوئی شکل میں ایک قیامت خیز ہنگامہ بپا تھا۔ نہ جانے کس طرح میری امی بھی وہاں پہنچ گئی۔ کوٹھے پر آ کر اس نے بھی ایک آدھ تھپڑ رسید کیا اور مجھے کھینچتے ہوئے نیچے لے گئی۔

"تم ہمارا اچھی طرح منہ کالا کرو گے۔"

دوسری منزل سے گزرتے ہوئے میں نے سنا! اختر دبے دبے ہچکیاں بھر رہی تھی۔ ماں اسے دنیا جہاں کی بد دعائیں دے رہی تھی اور اس کا باپ چارپائی پر بیٹھا سر ہلاتے ہوئے بار بار کہہ رہا تھا۔

"میں تو اب زہر کھا کر مر جاؤں گا"

لیکن دوسرے دن کا چمکیلا اور روشن سورج نئی امیدوں اور نئے ولولوں کے ساتھ طلوع ہوا اور اختر کا باپ زہر کھا کر مرنے کی بجائے آلوؤں کی تازہ فصل کا سودا چکانے منڈی کی طرف چل پڑا' میں لاہور چلا آیا اور اختر کو اس کی خالہ کے ہاں دہلی بھیج دیا گیا۔

ان دنوں میں آرڈیننس فیکٹری میں ملازم تھا۔ میں نے امی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اختر میری زندگی کی روشنی ہے اور اگر میری وہاں شادی نہ ہوئی تو میں اندھیرے میں گھر جاؤں گا اور گاڑی کے نیچے سر دے دوں گا۔ امی رونے لگ پڑی۔ بیچاری مائیں! وہ شادی کا سوال لے کر اختر کی ماں کے پاس گئی۔ اس نے گڑگڑا کر اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگی لیکن اختر کی ماں نے سرد مہری سے انکار کر دیا۔

"تیرے بیٹے نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا' وہ تو خیر ہوئی لڑکی کا ماموں گھر پر نہ تھا نہیں تو جانے کیا خون خرابہ ہوتا۔ ہم تو ہاتھ مل رہے ہیں بہن کہ لڑکی اس گلی میں پیدا ہی کیوں ہوئی۔"

میری امی ہاتھ ملتے ہوئے نامراد واپس آ گئی۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ شکست دل کی روداد سنی اور ہاتھ ملنے لگا۔ میں نے سوچا اختر اس وقت کیا کر رہی ہو گی؟ اسے دلی گئے دوسرا مہینہ جا رہا تھا اور میرے لیے اداس و ویران دل سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے مجبور ہو کر دلی بڑی آپا کو خط لکھا کہ دفتر میں ہفتہ بھر کی چھٹیاں ہو رہی ہیں اور میرا ارادہ دلی آنے کا ہے آپا نے فوراً جواب دیا کہ وہ سٹیشن پر ملازم بھیج دے گی۔ چنانچہ اسی ہفتے میں پہنچ گیا۔ آپا کا مکان تیار پور میں تھا۔ میں تانگے میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا

تھا اور علی پور روڈ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب نیم کے ٹھنڈی چھاؤں والے درخت تھے جن کے ہرے ہرے چکنے پتے دسمبر کی پرسکوں دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ملازم بیڑی پیتے ہوئے دلی کی ٹکسالی زبان میں بہادر شاہ ظفر کی داستان غم سنا رہا تھا۔ جب بہادر شاہ ظفر ہمایوں کے مقبرے میں چھپنے کے لیے کوئی موزوں جگہ ڈھونڈ رہا تھا' تو ہمارا تانگا تیار پور کی آبادی میں داخل ہو گیا۔ آپا اور ننھے منوں نے میرا پر جوش خیر مقدم کیا۔ شام کی چائے کے بعد بھائی جان برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے میں نے پہلے تو آپا کے نئے آویزوں کی جی کھول کر تعریف کی اور پھر ظاہراً بڑی بے نیازی سے پوچھا۔

سنا ہے آج کل اختر بھی یہیں ہے۔

آپا میری مکاری کو بھانپ گئی اور ہنستے ہوئے بولی۔

''واہ رے میرے چنو منو۔ گویا آپ کو تو کچھ پتا ہی نہیں۔ تم نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا۔''

آپا! تم بھی یہی خیال کرتی ہو؟ اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں اسے کہیں بھی نہیں چھوڑنا چاہتا اور ہر دم اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں اور اس میں میرا کوئی دوش نہیں ہے۔ خدا کے لیے یہ بتاؤ وہ یہاں کب آئی تھی؟

آپا ننھے کی اونی ٹوپی کے پھندنے کی مرمت کرتے ہوئے بولی۔

''پچھلے دنوں نوکر کے ساتھ آئی تھی۔ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ بیچاری تمہاری ہی باتیں کر رہی تھی۔ پر کچھ بیمار بیماری تھی۔ جانے اسے کونسا روگ اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے؟''

تمہاری ہی باتیں کر رہی تھی۔ پر کچھ بیمار بیماری تھی۔

میرا دل ایک دم بیٹھ سا گیا۔

وہ بیمار بیماری کیوں تھی؟ اسے کونسا روگ اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا؟

کیا میں ہی اس کی بدنصیبی کا باعث ہوں؟ میں نے آپا کے گھٹنے پکڑ لیے۔

''آپا....... تم میری بڑی ہی پیاری آپا ہو۔ تم مجھے گود میں سلایا کرتی تھیں۔ تمہارے مجھ پر بہت سے احسان ہیں۔ لیکن اب ایک اور احسان بھی کر دو۔ خدا کے لیے مجھے اختر سے ملا دو۔ ایک بار صرف ایک بار۔ میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ اس کی جدائی کا زمانہ میں نے اپنے بہترین دوستوں کے ساتھ ہنس ہنس کر گزارا ہے اور مجھے اس کی یاد نے ایک پل کے لیے بھی بے چین نہیں کیا اور میں اسے بالکل بھول چکا ہوں۔ اور وہ بھی مجھے بھول جائے۔ وہ مجھے' میری محبت کو' اس بیماری کو' اس روگ کو اپنے دل میں سنگھاسن سے دھکا

دے کر نیچے پھینک دے اور اس پر اپنی محبت کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دے اور کبھی بھول کر بھی یاد نہ کرے کہ کسی گھر کے آنگن میں شہتوت کے پیڑ تلے دو معصوم روحوں نے محبت کے سیدھے سادے گیت گائے تھے اور گڈی گڈے کا بیاہ رچایا تھا۔

میں بول رہا تھا اور میری آواز ڈوب رہی تھی اور آپا ننھے کی ٹوپی ہاتھ میں پکڑے منہ کھولے مجھے حیرانی سے تک رہی تھی۔ جب میں چپ ہو گیا تو اس نے مجھے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور میرے ساتھ وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ بیچاری بہنیں!

دوسرے ہی روز آپا نے ملازم بھیج کر اختر کو بلا بھیجا۔

اس دن آسمان پر بادلوں کی گردسی چھا رہی تھی۔ دھوپ کا رنگ پھیکا تھا اور سردی نسبتاً پہلے سے زیادہ تھی۔ بھائی جان دفتر گئے ہوئے تھے۔ میں اور آپا کمرے کے آتشدان کے پاس بیٹھے تھے۔ بچے برآمدے میں کھیل رہے تھے۔ آپا میز پوش پر بیل کاڑھ رہی تھی۔ اور میں یونہی کسی خیال میں گم چھوٹی چھوٹی چھٹیاں توڑ کر آتشدان میں پھینک رہا تھا۔ باہر کوئی تانگہ آ کر رکا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ آپا نے فریم ایک طرف رکھ دیا اور اتنا کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

شاید اختر آئی ہے تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔

میں نے دوسرے کمرے میں جا کر کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھا کہ ایک دبلی پتلی سی لڑکی' سیاہ نقاب اٹھائے برآمدے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اختر واقعی بیمار بیمار سی تھی۔ اس کا رنگ مرجھا رہا تھا اور چہرے پر خزاں کی دیوانگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ برآمدے میں آپا کو دیکھ کر مسکرائی اور مجھے وہ رات یاد آ گئی جب وہ اپنا سر میرے سینے سے لگائے وہ ہولے ہولے سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ چھوڑ دیا۔ اور میز کے کونے پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ ہمارے درمیان اس وقت صرف ایک دیوار حائل تھی مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ دیوار ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی زیادہ بلند ہے اور دیوار چین سے بھی زیادہ لمبی ہے اور میں اسے کبھی سر نہ کر سکوں گا اور اختر مجھے زندگی بھر نہ مل سکے گی۔ معاً دروازہ کھلا اور کمرے میں اختر نمودار ہوئی۔ ڈوپٹہ اس کے سر سے ڈھلک گیا تھا اور گرم شال اس نے یوں لپیٹ رکھی تھی گویا ابھی بستر سے اٹھ کر آ رہی ہو۔ تبسم کی ایک کرن نے چہرے کی اداسی کو زیادہ نمایاں کر دیا تھا۔ چند لحات ہم گہری خموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کمرے میں سنگین سکوت طاری تھا۔ اختر آہستہ سے آگے بڑھی۔ وہ میرے بالکل قریب آ کر رک گئی۔ اتنا قریب کہ مجھے اس کے چہرے کی افسردگی ایک دردانگیز الاپ بن کر سنائی دینے لگی۔ اس کے کپڑوں سے اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی دھیمی دھیمی مہک نے مجھے اپنے حلقے میں لے لیا اور میں نے دیکھا کہ اختر کی سپید گردن کے لطیف جھکاؤ میں ایک طرف ننھی سی نیلی رگ دھڑک رہی تھی اور اس کے تنفس کی مدھم آنچ میں ماؤنٹ ایورسٹ کی برف پوش چوٹیاں پگھلنے لگی تھیں اور اختر کی شال

کا رنگ پھیکا گلابی تھا۔ اس کے ہونٹوں کی مانند۔ میں نے اس کا کنول کا پھول ایسا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"اختر....... سوہن حلوہ نہیں لائی؟"

اور بیوقوف لڑکی رو پڑی۔ بھلا اس میں رونے کی کونسی بات تھی؟ عورتوں کے پاس اتنے آنسو کہاں سے آ جاتے ہیں؟ کیا وہ پانی زیادہ پیتی ہیں؟ مت رو اختر! تجھ میں نمک کی پہلے ہی سے کمی ہے۔ مگر اختر میرے بازوؤں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اور جب وہ کافی نمک ضائع کر چکی اور اس کی آنکھیں موسلا دھار بارش کے بعد نکھرے ہوئے آسمان کا سماں پیش کرنے لگیں تو اس نے مجھے بتایا کہ اس کے ماں باپ بہت جلدی اس کی شادی کر دینا چاہتے ہیں۔

"خالہ نے بر ڈھونڈھ لیا ہے۔ دو ایک روز میں بات پکی ہو جائے گی اور مجھے قبر میں سلا دیا جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"لڑکا کیا کرتا ہے؟"

اختر نے منہ پھلا لیا۔

"مجھے کیا پتہ۔ سنا ہے ملٹری کا ٹھیکیدار ہے"

"پھر تو خوب عیش کرو گی۔ بہترین پوشاک پہنو گی' بہترین غذا کھاؤ گی' تمہارے نیچے کار ہوگی اردگرد نوکر ہوں گے۔ خوب موٹی ہو جاؤ گی۔ خوب عیش کرو گی۔"

اختر نے زخمی ہرنی کی طرح تڑپ کر مجھے دیکھا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تم تو ایسا نہ کہو۔ ہائے تمہیں کیا خبر میرے دل پر چھریاں چل رہی ہیں۔ میں مر جاؤں گی۔ سچ میں مر جاؤں گی"

اور اختر ایک بار پھر میرے بازوؤں میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی اور میں نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"مت رو اختر۔ ہم بچپن کے ساتھی ہیں۔ ہماری محبت نے اس وقت آنکھیں کھولی تھیں جب ہم زمین پر لڑکھڑاتے ہوئے چلنا سیکھ رہے تھے۔ وہ شہتوت کی چھاؤں تلے ہمارے ساتھ کھیل کود کر پروان چڑھی ہے۔ اس کا بیج بڑی گہرائی میں پھوٹا تھا اور وہ اس وقت بھی ہم پر اپنی قوس قزح کے رنگ پھیلائے ہوئے تھی جب ہم ناخوں اور آلوچوں کے باغات میں کھیلیں کیا کرتے تھے اور کھٹی میٹھی گولیاں کھایا کرتے تھے۔ اسے ملٹری کا ایک ٹھیکیدار کیا اگر ساری ملٹری بھی چاہے تو ہمارے دلوں سے نہیں نکال سکتی۔ میں تمہیں اپنا

نہیں بنا سکا۔ اس کا مجھے دکھ ہے۔ مگر ہمیں ایک دوسرے سے جدا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تم نہ ہوگی مگر لوکاٹوں اور ناشپاتیوں کے باغ وہیں ہوں گے' املتاس کی شاخوں میں پھولوں کے زرد فانوس ہر سال روشن ہوں گے اور بہار کے دنوں میں درختوں کے بیچ سے ہو کر گزرنے والے نازک راستے خوشبوؤں سے مہک اٹھا کریں گے اور لال لال' قرمزی اور شربتی رنگ کے شہتوت جھول جھول کر بہار کا استقبال کریں گے اور ان کی ٹھنڈی چھاؤں میں پھر کوئی کمسن اختر اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی گیند کھیل رہی ہوگی۔ پہلا پہلا پا کے......"

درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے کہ اختر چلنے کے لیے برقع پہننے لگی۔ وہ تانگے میں سوار ہو رہی تھی اور میں اور آپا برآمدے میں کھڑے اسے رخصت کر رہے تھے اور جب نیم کے ٹھنڈے سایوں والی سڑک پر تانگہ اختر کو لے کر روانہ ہوا تو مجھے ایکا ایکی محسوس ہوا گویا میں بھی تانگے میں بیٹھا اس کے ساتھ جا رہا ہوں اور میں برآمدے میں نہیں ہوں' کمرے میں بھی نہیں ہوں' کہیں بھی نہیں ہوں' جب تانگہ دور۔ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو کوئی پراسرار آواز' سرگوشیاں میں مجھے یقین دلا رہی تھی کہ میں نے اختر کو' اپنے آپ کو' اپنی محبت کو دھوکا دیا ہے اور آلوچے کے باغوں میں بہار کبھی نہ آئے گی اور شہتوت کی ٹہنیوں پر لال لال قرمزی شہتوت اب کبھی جھول جھول کر بہار کا خیر مقدم نہیں کریں گے۔

اسی موسم سرما میں اختر کا بیاہ اس ملٹری کے ٹھیکیدار سے ہو گیا۔

برات دوسرے محلے میں اختر کی چچی کے ہاں آئی اور وہیں سے ڈولی بھی گئی۔ اختر کو کسی خاص مصلحت کی بناء پر شادی سے ایک ماہ قبل ہی وہاں قید کر دیا گیا تھا۔ دن چھپ رہا تھا کہ برات آئی اور رات دم توڑ رہی تھی کہ اختر کو ڈولی میں بٹھلا کر رخصت کر دیا گیا۔ وہ رات میں نے بستر میں لیٹے' چھت کی کڑیاں گنتے گنتے گزار دی۔ شادی والا گھر ہمارے گھر سے کافی دور تھا۔ لیکن مجھے دلہن کے گرد جمع ہو جانے والی لڑکیوں سے لاابالی قہقہوں کی جھنکاریں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ خاموش سائے کی طرح میں اس گھر میں گھوم پھر کر ہر شے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اختر گہنے پاتے سے لدی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس کے ماتھے پر افشاں کا غبار کہکشاں بن کر چمک رہا تھا۔ اس کا گورا رنگ پہلے سے کہیں زیادہ نکھر گیا تھا۔ پتلی نازک انگلیاں سونے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اس کے رخسار کا تل جیسے کچھ کہہ رہا تھا' کچھ سن رہا تھا۔ اختر کی سہیلیاں اسے بار بار چھیڑ رہی تھیں' اس سے چلبلیں کر رہی تھیں۔ مگر اختر نگاہیں جھکائے قالین کو ٹکٹکی لگائے تک رہی تھی۔ قریب ہی کچھ لڑکیاں ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں۔

پل پل جاناں ویرا...... کس دیس جاناں؟

ساڈی لمی اڈاری ویرا...... کس دیس جاناں؟

بھولے بھالے معصوم چہرے، چمکتی ہوئی روشن آنکھیں، مسکراتی کلیاں، الہڑ کونجیں۔ اڑنے کے لیے پر تول رہی ہیں نہیں جانتیں ان کی منزل کہاں ہے۔ ہمیں کہاں جانا ہے ہمیں کہاں جاناں ہے؟ بھائی خاموش ہے، ماں چپ ہے، باپ چپ ہے، کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں جائے گی۔ دلہن کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں اور دلہن کی ماں براتیوں کے لیے فرنی کی پلیٹیں گنوا رہی ہے۔ دلہن کی پلکوں پر آنسو کپکپا رہے ہیں اور دلہن کا باپ دلہا کے پاس سر جھکائے بیٹھا ہے۔ مولوی صاحب نکاح پڑھنے لگے ہیں۔ دلہا میاں کا چہرہ سہرے کے پھولوں میں چھپا ہوا ہے اور کلائی پر گھڑی کا نقرئی فریم چمک رہا ہے۔ مولوی صاحب لڑکی کے باپ سے لڑکی کی رضا پوچھ رہے ہیں اور اختر کا ماموں اوپر اختر سے پوچھ رہا ہے۔

''بیٹی کیا یہ لڑکا تمہیں منظور ہے؟''

بیٹی خاموش ہے۔ ماموں اپنا سوال دہراتا ہے۔ بیٹی کا سر جھک جاتا ہے۔ دلہن کی خالہ بیچ میں بول اٹھتی ہے۔

''آئے ہائے اب وہ بے زبان اپنے منہ سے تھوڑے کہے گی''

بیچاری بے زبان اور سمٹ گئی۔ منظور ہے، منظور ہے، بے زبان گائے کو وہ لڑکا منظور ہے۔ اسے ڈولی میں بٹھلا کر سسرال بھیج دو، بوچڑ خانے بھیج دو۔

مبارک مبارک نکاح ہو گیا' کونج اڑ گئی۔ براتیوں میں چھوہارے بانٹے جا رہے ہیں۔ لوگ ان پر بھوکی بلیوں کی طرح جھپٹ رہے ہیں۔ ایک آدمی کی پگڑی کھل گئی ہے۔ دوسرے کی ریشمی قمیض پھٹ گئی ہے۔ ایک شیروانی کوٹ سے کہہ رہی ہے۔

''یار چھوہارے تو پچھلی جنگ کے ہیں''

مولوی صاحب نوٹ جیب میں ٹھونس کر داڑھی میں انگلیاں پھیر رہے ہیں۔ اب کیا دیر ہے؟ کھانا لاؤ' کھانا لاؤ۔ کسی کی زبان پر یہ جملہ نہیں ہے مگر سب یہی کہہ رہے ہیں۔ مہمان کھانا کھا رہے ہیں اور گلی میں بیٹھے ہوئے لولے لنگڑے، کانے گنجے، بچے کچے، فقیر بھوکی ننگی نگاہوں سے انہیں تک رہے ہیں۔ لالچی کتے۔ انہیں پلاؤ کی خوشبو جانے کہاں کہاں سے کھینچ لاتی ہے۔ کھانا ختم ہو گیا۔ ہڈیاں کتوں کو ڈالی جا رہی ہیں۔ بارات کی رخصتی کا وقت آن پہنچا۔ کہار خالی ڈولی لے کر آ گئے ہیں۔ یہ ڈولی دلہن کو سسرال لے جائے گی۔ بوچڑ خانے لے جائے گی۔ بے زبان دلہن کو لاؤ۔ گائے کو لاؤ۔

کس دیس جاناں؟

کس دیس جاناں؟

سہیلیاں رخصتی کا نوحہ گا رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ چہرے غمزدہ ہیں۔ اختر کے سر پر تاروں جڑی ریشمی چادر ڈالی جا رہی ہے۔ وہ رو رہی ہے۔ وہ سسکیاں بھر رہی ہے۔ بے زبان کو گھر چھوڑنے کا کتنا دکھ ہو رہا ہے۔ ہر لڑکی کو ہوتا ہے۔ ہر لڑکی بھول جاتی ہے' اختر بھی بھول جائے گی!

دلہن کو ڈولی میں سوار کیا جا رہا ہے۔ دلہن کی سہیلیاں آنسو بہا رہی ہیں۔ اختر کہاں جا رہی ہو؟ اختر کب آؤ گی؟ اختر اجنبی دیس جا کر ہم سکھیوں کو بھول نہ جانا۔

کہاروں نے ڈولی اٹھالی ہے۔ ڈولی بن پتوار کشتی کی مانند وقت کی لہروں پر ڈولتی ہوئی گلی میں سے گزر رہی ہے۔ گلی میں خالی دیگیں ایک طرف لگائی جا رہی ہیں۔ بڑے بڑے چولہوں میں کتے راکھ اڑا رہے ہیں اور مکانوں کی آخری چھتوں کے اوپر۔ بہت اوپر' سرد اور نیلے آسمان پر ستاروں کا نور ٹھٹھر رہا ہے اور میں بستر میں لیٹا چھت کی طرف تک رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں اختر دلہن بن کر میرے گھر کیوں نہ آئی؟ بیچارہ میں!

ایک ماہ بعد میں نے اختر کو دیکھا اور دیکھتے ہی ٹھٹھک سا گیا۔ اس میں اور شادی سے پہلے کی اختر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس نے اودھے رنگ کا بھاری کامدار جوڑا پہن رکھا تھا۔ سرخ جارجٹ کے دوپٹے میں سفید لپا لگا تھا۔ وہ اپنے مکان کی کھڑکی میں کھڑی تھی اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ میں ایک طرح کا نرالا بانکپن اور شگفتگی تھی۔ چہرے کا رنگ نکھر کر شہابی ہو رہا تھا اور جسم پہلے سے کہیں زیادہ سڈول معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے مجھے دیکھ کر یوں ہونٹ سکیڑے گویا ہوا کا پیار لے رہی ہو اور پھر خود ہی شرما کر کھڑکی بند کر دی۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

اب میرے لیے اس شہر میں کوئی کشش باقی نہ رہی تھی۔ میں نے اپنا اٹیچی کیس اٹھایا اور رنگون چلا گیا۔ یہاں میں نے ملازمت کر لی اور ایک چاندنی رات میں نے دریائے رنگون میں کشتی کی سیر کرتے ہوئے اختر کے تمام خطوط کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ اسی سال مجھے خبر ملی اختر کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی اور برما کے دیہاتوں میں گھوم پھر کر کام کرنے لگا۔ ایک بار پھر انسن کے ریلوے ورکشاپ میں آپا کا خط ملا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ اختر نے جڑواں بچوں کو جنم دیا ہے۔ تو پھر میں کیا کروں؟ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ شاید اس کے خاوند نے اب بچے پیدا کرنے کا ٹھیکہ لے لیا ہو۔ میں انسن سے رنگون آ گیا اور چپکے سے رنگون کی بندرگاہ سے جہاز میں سوار ہو کر کلکتے پہنچ گیا۔ آوارہ گردی نے میرے دل کو کافی تسکین پہنچائی تھی۔ لیکن اختر کو نہ بھلا سکا تھا۔ اس کی بھیگی بھیگی یاد میرے دل سے محو نہ ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں یادوں کے نت نئے پھول کھلتے گئے۔ جب

بنگال سے جی بھر گیا تو مدراس جا ڈیرا لگایا۔ وہاں سے سیلون اور سیلون سے پھر پنجاب کے میدانوں اور دریاؤں کا رخ کیا۔ میں جہاں جہاں گیا اختر کے سوگوار خیال نے پیچھا کیا۔ اس کے بعد فساد شروع ہو گئے۔ میں نے سنا اختر کانپور میں ہے اور اسے ایک اورلڑکی پیدا ہوئی ہے۔ ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ مگر اختر کا خیال تقسیم نہ ہو سکا۔ ہم لوگ پاکستان آ گئے۔ اختر کا خیال بھی میرے ساتھ ہی آیا۔ میں ہر گھڑی سوچتا رہتا۔ وہ کہاں ہو گی؟ کیسے ہو گی؟

میں اب بھی اسی کے متعلق سوچ رہا ہوں' لیکن میں اس لڑکی کو ابھی تک نہیں پہچان سکا۔ جس نے اپنا نام اختر بتایا تھا اور جو زنانہ ہسپتال کے باہر بدررو کے پل پر بیٹھی تھی۔ جنہیں۔ جلا ہوا مکان الاٹ ہوا تھا' جس کا خاوند کانپور میں اپنا سب کچھ لٹوا کر آنے کے بعد لوکوشاپ میں ملازم ہو گیا تھا' جس کی آنکھوں میں جلے بجھے سگریٹوں کی راکھ تھی۔ جس کے ہونٹ خشک ندی کے بنجر کنارے تھے اور جس کی چھاتی سے ایک جونک چمٹی ہوئی تھی اور جس نے پوچھا تھا۔

تم نے مجھے پہچانا نہیں؟

برف گرنے تک

پچھلے کئی دنوں سے برف نہیں گری۔ آسمان پر ہر وقت چھایا رہنے والا کہرا غائب ہو چکا ہے اور چمکیلے سورج کی درخشانی پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ دن بھر روشن اور پر سکون دھوپ میں چیلیں اپنے پر تولے وادیوں کے اوپر منڈلاتی رہتی ہیں اور مسلسل برفباریوں سے ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو گرماتی رہتی ہیں۔ چنار کے درختوں میں ننھے ننھے سرخ شگوفوں نے قمقمے سے جلا رکھے ہیں اور چیڑ دھیمی دھیمی خنک مہک دینے لگے ہیں۔ خوبانی' بادام' بتنگ اور آلوچوں کے درخت گلابی اور سپید شگوفوں سے لد گئے ہیں اور مکانوں کی ڈھلوانی چھتوں' چھجوں اور بجلی کے کھمبوں پر جمی ہوئی برف پگھل چکی ہے۔ دن کو اگرچہ سرد ہوا چلتی ہے مگر نیم گرم دھوپ میں' گہرے نیلے آسمان تلے وہ بڑی خوشگوار محسوس ہوتی ہے اور خنک جھونکے شانوں کو ہمدرد دوستوں کی طرح پیار سے تھپتھپاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ لیکن رات کو کافی ٹھنڈ ہو جاتی ہے اور بستر میں گرم بوتل رکھ کر سونا پڑتا ہے۔ شام کے وقت جب سنہری دھوپ کی چمک ماند پڑ جاتی ہے اور نچان کی وادیوں میں ہلکی ہلکی دھند جالا سا بننے لگتی ہے تو رات کے مرطوب اور خاموش اندھیرے مکانوں' درختوں اور ڈھلوان پر اگے ہوئے صندل کے گنجان' جنگلوں کو گھیر لیتے ہیں اور اوپر بلند پہاڑوں کی برف آلود چوٹیوں سے پھسلتی ہوئی ہواؤں کے سرد جھونکے بند کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکراتے ہیں اور ان پر شبنم سی بکھیرنے لگتے ہیں۔ نیلے آسمان پر چمکیلے ستاروں کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں۔ دھیرے دھیرے ان آوازوں پر خوابوں کے سائے جھک جاتے ہیں اور خواب گاہوں کی روشنیاں مدھم ہو جاتی ہیں اور باہر ٹھنڈی نیلی رات کا حسن نکھرنے لگتا ہے ستاروں کی ٹولیاں نہ معلوم منزل کی جانب اپنا سفر جاری رکھتی ہیں اور صندل کے جنگلوں کی طرف سے آنے والی خوشبو چیڑ کی مہک سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔ ناشپاتی' سیب اور آلوچوں کے شگوفے اپنی ریشمی پلکیں موند لیتے ہیں۔ درختوں تلے گہرے تاریک سائے سرگوشیاں سی کرنے لگتے ہیں اور برف آلود پہاڑی بلندیوں سے آنے والے برفیلے جھونکے چیڑ کے نوکیلے جھومروں اور چنار کی نیم خوابیدہ ٹہنیوں کو چھو کر گزرتے ہیں تو وہ جھولنے لگتی ہیں اور ناچنے لگتی ہیں۔ ستارے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائے عروس شب کا یہ ازلی و ابدی رقص دیکھتے رہتے ہیں۔ جس میں کوئی دائرہ نہیں ہوتا' کوئی قوس نہیں بنتی' کوئی خم نہیں' کوئی پیچ نہیں' کوئی ساز نہیں' کوئی ڈانس نہیں۔ بے آواز' بے ساز' خاموش و پر اسرار رقص۔ جھوم جھول رہے ہیں' ٹہنیاں

جھوم رہی ہیں' پتے سرسرا رہے ہیں۔

سرر سرر سرر سرر

جیسے نشے میں ڈوبی ہوئی تھکن سے چور رقاصہ گھاس پر چل رہی ہو' جیسے محبت کے گرم لمس پر گوٹہ لگے ریشمی آنچل سرک رہے ہوں'
جیسے برف کی سپید سپید کلیاں گر رہی ہوں۔

سرر سرر رقص جاری ہے۔ رقص نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔

لیکن پچھلے دنوں سے برف نہیں گری اور ٹیمز کافی ہاؤس کے خوش شکل پٹھان بیرے کا خیال ہے کہ برف اب نہیں گرے گی۔
کیونکہ بہار شروع ہو چکی ہے۔ اس بیرے کا رنگ سرخ و سپید ہے اور قد کاٹھ بے حد موزوں ہے۔ اس کی مضبوط کمر' چوڑے شانوں
اور بھورے رنگ کی آنکھوں کو دیکھ کر اس پر کافی ہاؤس کے مالک کا گمان ہوتا ہے جو تفریحاً بیروں کی وردی پہنے ہوئے ہو۔ مگر جب
ٹپ لینے کے لیے اس کی مضبوط کمر جھک جاتی ہے اور ہونٹوں پر احمقانہ تبسم نمودار ہوتا ہے تو خواہ مخواہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ پیدا ہی اس
کام کے لیے ہوا ہو۔ شخصیت کا یہ نمایاں تضاد کافی ہاؤس میں بھی موجود ہے۔ باہر سے دیکھنے پر اس پر ریل گاڑی کا گمان ہوتا ہے لیکن
اندر بیٹھ کر آپ کو محسوس ہو گا کہ آپ کسی بحری جہاز کے لاؤنج میں بیٹھے ہیں جہاں جھکی ہوئی نیچی چھت کا روغن چمک رہا ہے اور کھلی
کھڑکیوں پر سبز رنگ کے پردے ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ ٹیمز کافی ہاؤس اوپر بستی کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے واقع ہے۔
کافی ہاؤس کی تمام چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کا رخ سڑک کی جانب ہے۔ ہر کھڑکی کے پھول دانوں میں رنگ برنگ کے پھول مسکرا رہے
ہیں۔ آخری کھڑکیوں کی طرف ابھی ابھی دو آدمی آ کر بیٹھے ہیں۔ ان میں ایک بیحد لاغر اور مریل سا ہے۔ اس کا رنگ ہلدی کی مانند
ہے اور گنجے سر کی کنپٹیوں پر چند ایک سفید بال چمک رہے ہیں۔ وہ دونوں ہاتھ بھوسے رنگ کے اوور کوٹ میں دیئے ہوئے ہے۔ اس کی
باندی کی موٹھ والی آبنوسی چھڑی اس کے گھٹنے سے لگی ہے۔ وہ بڑی اداس نگاہوں سے نیچے سڑک پر آنے جانے والوں کو تک رہا ہے۔
دوسرے آدمی کا رنگ سیاہی مائل ہے اور پھولے ہوئے بھدے چہرے پر چیچک کے گہرے داغ دور سے صاف دکھائی دے رہے
ہیں اس کی سفید دھاری دار نیلی اچکن کی اوپر کی جیب میں گھڑی کی طلائی زنجیر لٹک رہی ہے۔ وہ جب سے یہاں بیٹھا ہے کئی بار ناک
صاف کر چکا ہے اور بیرے کی آنکھ بچا کر اپنی کرسی کے پیچھے تھوک چکا ہے۔ بیرا کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ان کے لیے کافی تیار کر رہا ہے۔
میری پیالی میں کافی کا آخری گھونٹ رہ گیا ہے۔ پائپ میں تھری نائن کا مرطوب تمبا کو دھیمے دھیمے سلگ رہا ہے اور ارد گرد اس کی
خوشگوار فلیور کے ساتھ کافی کی تلخ مگر پرسکون مہک مخلوط ہو رہی ہے۔ سڑک پر سہ پہر کی ماند دھوپ میں لوگ بے فکری سے چل پھر

رہے ہیں۔ کسی وقت ایک آدھ کشمیری مزدور سامان سے لدے ہوئے رکشا کو اوپر کی طرف کھینچے لیے جاتا نظر آتا ہے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ اڈے پر ابھی ابھی کوئی بس آئی ہے اور میدانوں کی گرمی سے بھاگے ہوئے لوگوں کا ایک اور ٹولہ پہاڑوں پر موسم گزارنے آن پہنچا ہے۔ بستر ہی بستر' صندوق ہی صندوق' پنگوڑے' ٹیفن کریز' واشنگ ٹب' منہ دھونے والے بیسن' حقے' لوٹے' کتابیں' چارپائیاں' کموڈ' سوٹ کیس اور ان میں فراک' ریشمی رومال' عطر' خوشبودار تیل' یارڈلے کی ہاتھوں کو لگانے والی کریم' منہ کو لگانے والی سنو' نمیوں کے دوپٹے ساٹن کی شلواریں' گرم کوٹ' بے شمار ٹائیاں' میچنگ سٹیس' پاؤنڈز' کوئی روج' ایوننگ ان پیرس' لندن' نیویارک' دھلے ہوئے تولیے' لمبے چوڑے' بوردار' جن' سے شاور باتھ لینے کے بعد سارا جسم لپیٹ لیا جاتا ہے۔ شاور باتھ لیتے ہوئے کتنا مزہ آتا ہے۔ پانی کی نرم نرم پھوار خواب آلود گنگناہٹ جسم پر برستی ہے' جیسے ان گنت ننھے ننھے' نرم نرم ہونٹ بدن کو چوم رہے ہوں' جیسے ساون کی ہلکی جھڑی لگی ہو اور جسم بھیگ رہا ہو اور رکشا کھینچنے والے ہاتو کا جسم بھی بھیگ رہا ہے' پانی سے نمکین پانی سے۔ پہاڑوں پر نمکین پانی زیادہ استعمال کرنا چاہیے۔ ہاتو نمکین شاور باتھ لے رہا ہے آہا کتنا مزہ آتا ہوگا اسے جیسے ان گنت ننھے ننھے نرم نرم ہونٹ۔ جیسے ساون کی جھڑی اور جیسے پسینے کے۔ بیل رکشا اوپر کھینچے لیے جا رہا ہے اس کا دم پھولا ہوا ہے اور وہ ہانپ رہا ہے۔ پیچھے ایک اور ٹولی اوپر چلی آرہی ہے۔ کچھ نوجوان خوش پوش لڑکے' کچھ برقع پوش نوجوان لڑکیاں' سوٹوں کے رنگ ٹائیوں کے رنگ جوتوں سے میچ کر رہے ہیں۔ لیکن گفتگو خوبصورت چہروں سے میچ نہیں کر رہی۔ برقعے اڑ رہے ہیں۔ شلواریں پھڑ پھڑا رہی ہیں' غرارے لہرا رہے ہیں' نقاب اٹھ رہے ہیں' چہروں پر پاؤڈر کے پھیکے غبار' ہونٹوں پر لپ سٹک کی یاقوتی تہیں' سرخ' گلابی' گہرے سرخ ہونٹ' پنجابی بولتے ہوئے' اردو بولتے ہوئے' انگریزی بولتے ہوئے' فقرے' ہنسی' مذاق قہقہے' آوازیں' خوشبوئیں' رقص' سر سر لیکن بے ہنگم' پرشور' پرپیچ

آئی لائک ہل ٹو پس'

آئی ہیٹ پلیز'

ہیلو یو ڈرٹی گرل'

ڈیم دو یو فولش

ٹولی آگے نکل گئی ہے اور رکشا کھینچنے والا بیل اوپر چڑھائی پر چوک والا موڑ مڑ گیا ہے۔ اور میرا پائپ دھیمے دھیمے سلگ رہا ہے۔ سامنے والے گرجا گھر کے پاس دیوار کے درخت تلے ایک بوڑھا تنے سے ٹیک لگائے' آنکھیں بند کیے چھوٹی چٹائی پر بیٹھا تسبیح پھیر رہا ہے۔ پاس ہی سنگین چبوترے پر ایک نائی اپنے گاہک کا سر مونڈ رہا ہے۔ استرے کا رنگین دستہ اس کی آخری دونوں انگلیوں سے

باہر نکلا ہوا ہے اور گھسا ہوا پھل سر سر کی آواز سے گا ہک کی کھوپڑی پر چل رہا ہے۔ گرجا گھر کے پچھواڑے راہب خانے کی دیوار کے ساتھ بچ کی باڑھ لگی ہے۔ ساتھ ہی چھوٹی سی کھائی ہے اس کھائی میں سے ابھی ابھی ایک پٹھان اٹھا ہے اور وہ اب کنارے پر باڑھ کے ساتھ کھڑا' ازار بند ہاتھ میں تھامے' بازار کی طرف منہ کئے ڈھیلا کر رہا ہے۔ گرجا گھر کے مینار کی صلیب پر بیٹھا ہوا تنہا کالا کلوٹا پہاڑی کوا گردن میوڑائے عجیب انداز سے پٹھان کو تک رہا ہے۔ وہ کیا دیکھ رہا ہے؟ وہ کیا سمجھنے کے لیے اپنے ننھے سے دماغ پر زور ڈال رہا ہے؟ اب جانور بھی انسانوں کو یوں گستاخانہ گھورنے لگے ہیں۔ شاید انہیں ابھی تک علم نہیں ہوا کہ انسان ترقی کے تمام مدارج طے کر چکا ہے اور اب وہ پورا مہذب بن گیا ہے' لیکن وہ مکار کوا اتنا بے شرم کیوں ہے؟ اسے پتہ نہیں انسان ڈھیلا کر رہا ہے۔ آخر جانور جو ٹھہرا' کالا کلوٹا' مکار جانور' بے شرم' بے حیا' شی! شی!!! اڑ جا' اڑ جا' ادھر مت دیکھ' ادھر پردہ ہے' ادھر گرجا ہے' ادھر شاور باتھ ہے' نہیں اڑتا' نہیں جاتا؟

ڈیم وو یو فولش۔

گرجے کی دیواروں سے چمٹی ہوئی بیل میں ہری ہری پتیاں نکل رہی ہیں۔ گوتھک طرز کا لمبا اونچا دروازہ بند ہے اور اس کے اوپر انگور کی بیل نے گھونگھٹ سا ڈال رکھا ہے۔ بیل کے سبز چوڑے پتوں میں کہیں کہیں سیاہی مائل گہرے قرمزی انگوروں کے گچھے لٹک رہے ہیں۔ بیل کا ایک سرا دھاگے سے باندھ کر مینار کی طرف لے جایا گیا ہے۔ چوڑے پتے صرف چھت تک پہنچ سکے ہیں۔ یہ بیل نہ جانے مخروطی مینار کی صلیب تک کب پہنچے اور کب وہاں قرمزی انگوروں کے گچھے روشن دھوپ میں چمکیں۔ مسلسل برفباری کی وجہ سے صلیب کا رنگ سیاہ ہو رہا ہے اور کوا بدستور گردن جھکائے نیچے تک رہا ہے۔ بے شرم جانور! گرجے کے صحن والے پلاٹ کی نرم چکیلی گھاس ابھی تراشی نہیں گئی۔ پلاٹ کے وسط میں ٹینگ کا چھوٹا سا درخت ہے جس کی ٹہنیاں سفید شگوفوں سے لدی پھندی ہیں۔ کسی وقت ہوا کا جھونکا ذرا تیزی سے گزر جاتا ہے تو شگوفوں کی نازک پتیاں جھڑ جھڑ کر نیچے گرنے لگتی ہیں اور گھاس کے لمبے خوشوں پر کہکشاں سی بن گئی ہے۔ پلاٹ کے چاروں طرف خاردار جنگلا ہے۔ جنگلے کی پرلی طرف سے اونچی جگہ پر خانابنیوں تلے دو تین بھیڑیں پتھروں کے درمیان اگی ہوئی گھاس چر رہی ہیں۔ کسی وقت وہ قدم قدم چلتی خاردار جنگلے کے قریب آ کر پلاٹ کی ہری بھری گھاس کو للچائی ہوئی نگاہوں سے تکتی ہیں' گرجے کے بند دروازے کی طرف منہ کر کے ایک آدھ بار ممیاتیں اور پھر واپس مڑ جاتی ہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

''معصوم بھیڑوں کو میرے قریب آنے دو۔ وہ عبادت کرنے آتی ہیں''

اور گرجا گھر کے پادری نے خاردار باڑ لگواتے ہوئے کہا تھا۔

''معصوم بھیڑوں کو دور ہی رہنے دو۔

وہ پھولوں کا ستیاناس کرنے آتی ہیں۔''

لیکن معصوم بھیڑیں بڑی ڈھیٹ ہیں۔ ان کے ضمیر بالکل مردہ ہو گئے ہیں۔ وہ پھر بھی گرجے کے بند دروازے کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر میاتی ہیں اور ناامید ہو کر واپس مڑ جاتی ہیں اور نہ جانے کب تک یونہی۔ آتی رہیں گی اور واپس مڑتی رہیں گی۔

معصوم بھیڑیں خوبانیوں کے درختوں تلے گھاس چر رہی ہیں بوڑھا آنکھیں بند کئے چٹائی پر بیٹھا تسبیح پھیر رہا ہے۔ کھائی کنارے بازار کی طرف منہ کئے پٹھان ابھی ڈھیلا کر رہا ہے اور کوا اسے بار بار دیکھ رہا ہے۔ نائی کا کند استرا گاہک کے آدھے سر کا صفایا کر چکا ہے۔ اور گرجا گھر کے اوپر۔ ٹیلے پر سامنے والے کاٹج ماؤنٹ ویو میں ٹھہری ہوئی تینوں لڑکیاں اپنے لان میں نکل آئی ہیں۔ ان کی سہ پہر کی چائے کا وقت ہو چکا ہے۔ وہ جب سے اس کاٹج میں آئی ہیں سہ پہر کی چائے اپنے لان میں سیب کے درخت کے قریب بیٹھ کر پیتی ہیں اور انہیں یہاں آئے چند ہی روز ہوئے ہیں۔ آخری برف باری کے موقع پر وہ یہاں نہ تھیں۔ ماؤنٹ ویو برفیں پگھلنے سے پہلے پہاڑ کی دوسری کوٹھیوں کی مانند بند پڑا تھا۔ ان دنوں جبکہ برف لگاتار گرتی تھی اور دن رات برف کے طوفان وادیوں میں چیخا کرتے تھے۔ ماؤنٹ ویو کے ویران برآمدے میں دو ایک کشمیری کنبے مقیم تھے۔ عورتوں اور مردوں نے مل کر برآمدے کو تینوں اطراف سے نمدوں سے ڈھانپ دیا تھا۔ مگر نمدے پھٹے ہوئے تھے اور جگہ جگہ سے میلی روئی باہر جھانک رہی تھی۔ رات کو جب برف گرتی تو تیز ہوائیں فراٹے بھرتی برآمدے میں گھس جاتیں۔ اور دن چڑھے کشمیری عورت پھٹے پرانے فرن پہنے دونوں ہاتھوں سے برف باہر پھینکتی دکھائی دیتیں۔ رات بھر ان کے بھوکے ننگے بچے سردی میں روتے رہتے۔ عورتیں انہیں جھڑک جھڑک کر چپ کرانے کی کوشش کیا کرتیں اور مرد دونوں کو گالیاں دیتے رہتے۔ سارا دن نمدوں کے سوراخوں میں دھوئیں کے گاڑھے مرغولے باہر نکلا کرتے اور مرد باہر برف میں گھٹنوں تک دھنسے کلہاڑیوں سے جھاڑیوں کو کاٹتے کے انہیں اور کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ جھاڑیاں بڑی مفید ہوتی ہیں ان میں تمام طاقتور وٹامن موجود ہوتے ہیں۔ جب ہی وہ آپس میں خوب لڑا کرتے تھے اور کبھی کبھی ہاتھا پائی تک بھی نوبت پہنچ جاتی اور یہ لڑائی ہمیشہ جھاڑیوں کی کٹائی اور انہیں تقسیم کرنے پر ہوتی تھی۔

لیکن جب پہاڑوں پر برفیں پگھلنا شروع ہو گئیں اور آلوچوں خوبانیوں ناشپاتیوں اور سیب کی برف میں بھیگی ہوئی ننگی ٹہنیوں پر

سفید' گلابی اور سرخ شگوفے پھوٹنے لگے اور دن روشن اور راتیں چمکیلی ہوگئیں اور نیچے۔ نیچے گنجان شہروں' تنگ گلیوں' گندے مکانوں اور مکانوں کے تاریک بلوں میں رہنے والے بیمار مدقوق چوہوں نے گرمی' گرمی پکارتے ہوئے پہاڑوں کا رخ کیا تو ماؤنٹ ویو کاٹج کے برآمدے میں جھولتے ہوئے پھٹے پرانے نمدے لپیٹ دیئے گئے' برف میں گھٹنوں تک ڈوب کر کاٹی ہوئی جھاڑیوں کے گٹھے باندھے گئے' چولہے ڈھے گئے اور غلیظ فرنوں والی عورتیں' روتے بسورتے ٹھٹھرے ہوئے بچے اٹھائے اپنے کرخت چہروں والے مردوں کے پیچھے پیچھے نیچے اتر گئیں۔ نیچے گرجا گھر تھا۔ عورتیں اور مرد جنگلے کے پاس پہنچ کر پل بھر کے لیے رکے' ویران نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور اوپر کی طرف دیودار کے درختوں کی طرف چل پڑے۔ بھیڑوں کو دور ہی رہنے دو' یہ ہری ہری گھاس کا ستیاناس کر جاتی ہیں اور بھیڑیں درختوں کے عقب میں غائب ہوگئیں۔ نچان کی چراگاہوں میں اتر گئیں اور ان چراگاہوں سے بھی نیچے۔ بہت نیچے' گنجان شہروں کی سنگین چار دیواری میں رہنے والی بھیڑیں اوپر آ گئیں۔ اور ماؤنٹ ویو کی سبز کھڑکیوں پر ہلکے سبز جالی دار پردے لہرانے لگے۔ ڈرائنگ روم کا فرش قالین کی دبیز تہہ سے ڈھک گیا' پھول دار صوفے آتشدان کے قریب کھسک آئے اور ان پر نیم گرم کشن اور کارنس پر چینی کے پھولدان اور پھول دانوں میں خوبانیوں کی پھولوں بھری ٹہنیاں سج گئیں۔ برآمدے میں لٹکتے ہوئے گملوں میں خار دار گھاس کے لمبے لمبے خوشے باہر جھولنے لگے۔ لان کی گھاس ہموار کی گئی اور وہاں بید کی سبز کرسیوں کے درمیان تپائی پر پیتل کے راکھدان میں تھری نائن کے سگریٹ بجھنے لگے' آتش دان میں دھڑا دھڑ کھنگلے اور لکڑیاں جلنے لگیں اور ان کا دھواں نمدوں کے سوراخوں کی بجائے دودکش میں سے نکلنے لگا۔ اور دن ڈھلے جب سنہری دھوپ میں گہرے نیلے آسمان تلے خنک ہوا پھولوں کی خوشبوؤں سے گرانبار ہو کر صندل کے جنگلوں میں جھومنے لگتی تو تین لڑکیاں شاندار لباس پہنے' لان میں سیب کے درخت کے پاس کرسیوں پر آ کر بیٹھ جاتیں اور ایک موٹی عورت تپائی پر چائے کا سامان چننے لگتی۔ وہ تینوں لڑکیاں اس وقت بھی سنہری دھوپ کی مدھم چمک میں کرسیوں پر بیٹھی ہیں۔ موٹی عورت ابھی چائے کا سامان نہیں لائی۔ ہوا دھیرے دھیرے چل رہی ہے اور سیب کی ٹہنیاں بے معلوم انداز میں جھول رہی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی جس نے ساٹن کی سفید شلوار سفید قمیض اور گلے میں نینوں کا نارنجی ڈوپٹہ ڈال رکھا ہے گود میں ہلکے نیلے رنگ کی اون کا گولہ لیے سلائیوں سے کچھ بن رہی ہے۔ گھنگھریالے بال اس کے گول گول شانوں کو چھو رہے ہیں۔ دوسری لڑکی کا رنگ گورا اور سرخ ہے۔ قد چھوٹا اور بال گہرے سیاہ ہیں جنہیں اس نے عجیب انداز سے اکٹھا کر کے گردن پر گوندھ رکھا ہے۔ یہ لڑکی نیلے بارڈر والی سلیٹی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ہے اور آرام کرسی پر نیم دراز' اخبار کا مطالعہ کر رہی ہے۔ تیسری لڑکی کا رنگ بالکل زرد ہے۔ وہ بڑی دبلی پتلی لاغر سی ہے اور بسنتی رنگ کا غرارہ اس کے اپنے رنگ سے خوب میچ کر رہا

ہے۔ بھورے رنگ کے بالوں کی دولٹیں اس کے کندھوں سے ہوتی ہوئی چھاتیوں پر پڑی ہیں۔ ماتھے پر بالوں کے بڑے بڑے پف دو بھوری بھوری چٹانیں سی بنا رہے ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر لپ سٹک کا احمریں رنگ دور سے دمک رہا ہے اور وہ اداس نگاہوں سے سیب کی شگوفوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کو دیکھ رہی ہے اور تھری نائن کے ہلکے ہلکے کش لے رہی ہے۔ موٹی خادمہ دروازے پر نمودار ہوئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے سامان سے بھرا ہوا ٹرے ہے وہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہلکے زرد رنگ کی چیکوسلاویکی پیالیاں اور ان میں گرتی ہوئی گرم' خوشبودار' سنہری چائے' نرم گھاس' سیب کے شگوفے' سنہری دھوپ' نیلا آسمان' ہوا کے مہکے ہوئے پرسکون جھونکے' نیم روشن خواب گاہیں' قالین' کش' آتشدانوں میں دہکتی ہوئی آگ اور تھری نائن کی خوش گوار مہک۔ انسان کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ وہ کشمیری کنبے' وہ جھاڑیوں کی کٹائی پر جھگڑنے والے مردوہ گندے فرنوں والی عورتیں اور روتے ہوئے غلیظ بچے یہاں سے کیوں چلے گئے تھے؟

بدذوق' غیر آرٹسٹ۔ نان سینس۔ شاید وہ نیچے وادیوں میں نکل گئے ہوں۔ شاید انہوں نے جنگل میں کسی جگہ چیڑ کے درختوں تلے وہی نمدے لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہو' اور رات کو عورتیں بچوں کو چپ کراتی ہوں اور مرد انہیں موٹی موٹی گالیاں دے رہے ہوں اور جھاڑیوں کی کٹائی پر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے ہوں اور چولہوں میں آگ سلگ رہی ہو' نمدے کے سوراخوں سے گاڑھے دھوئیں کے مرغولے نکل رہے ہوں۔ دھوآں۔ پھونکیں۔ پھر دھوآں اور کھانسی اور موت۔ یہ لوگ کتنی جلدی دنیا کے دکھوں سے نجات حاصل کر جاتے ہیں۔ خوش قسمت لوگ! آزاد لوگ! حسین چرواہے! رومانی گڈریئے! چولہے میں آگ نہیں جل رہی۔ ٹین کی زنگ آلود بالٹیوں میں پانی گرم نہیں ہو رہا' دھوئیں میں دم گھٹا جا رہا ہے۔ پانی ابھی گرم ہو جائے گا اور ہلکے زرد رنگ کی چیکوسلاویکی پیالیوں میں سنہری اور خوشبودار چائے گرنے لگے گی۔ نازک پلیٹوں میں آلوچے کا لذیذ مربہ پڑا ہو گا اور گندے فرنوں والی عورتیں اور کرخت چہروں والے مرد تپائی کے اردگرد جمع ہو جائیں گے اور وہ پودوں کی جڑیں رغبت سے کھانا شروع کر دیں گے۔

پودوں کی جڑیں بڑی طاقتور ہوتی ہیں شروع شروع میں انسان یہی کھایا کرتے تھے اور وہ دیر تک زندہ رہا کرتے تھے وہ لوگ بڑے مضبوط تھے اور چیکوسلواکیہ کی پیالیاں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔ جہاں کی پیالیاں اتنی خوبصورت ہیں وہاں کے لوگ کیسے ہوں گے۔ اے گندے فرن والی غلیظ عورت! چیکوسلوکیہ چلو! وہاں کی پیالیاں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں' وہاں چولہوں میں گیلی لکڑیاں نہیں جلتیں' اور دھوآں نمدوں کے سوراخوں کی بجائے دودکشوں میں سے ہو کر گزرتا ہے اور اخیر دسمبر کی راتوں میں جب برف کے طوفان وادیوں میں چیختے ہیں اور چٹانوں کے ٹوٹ کر گرنے کی مہیب آوازیں آتی ہیں تو لوگ برآمدوں میں پھٹے ہوئے نمدوں

کے پیچھے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر جانے کی بجائے بند کمروں میں آتشدانوں کے قریب بیٹھے ہوتے ہیں' گرم و پرسکون کافی سے لبریز پیالیاں ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں اور زبان پر حسین ترین شہزادیوں اور جنگجو جرنیلوں کی عشقیہ داستانوں کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن تم چیکوسلویکیہ کیسے جاسکتی ہو' ابھی تمہیں آگ جلانا ہے ابھی لکڑیاں گیلی ہیں' ابھی کھنگے نمدار ہیں' ابھی پانی گرم نہیں ہوا' ابھی دھوئیں میں دم گھٹ رہا ہے' زور سے پھونکو شاید ایک دم شعلہ بھڑک اٹھے اور دھوئیں کا سیاہ غبار چھٹ جائے اور پھر پانی کھولنے لگے اور پیالیوں میں سنہری چائے گرنے لگے اور سیب کے شگوفے مسکرا اٹھیں اور آلوچے کا مربہ' پھول' خوشبو' روشنی' قہقہے' زندگی' رقص۔

ماؤنٹ ویو کے عقب میں ذرا اوپر جا کر ایک ٹیلے پر چیڑ کے جھرمٹ تلے سنی ٹوریم کی سرخ ڈھلوانی چھتیں صاف نظر آ رہی ہیں۔ سینی ٹوریم کی تقریباً تمام کھڑکیوں کے پٹ کھلے ہیں اور صحن کے باغ میں چند ایک مریض کندھوں پر سرخ کمبل ڈالے بنچوں پر بیٹھے ہیں۔ وہ سکڑے سے ہیں اور اپنی نحیف گردنیں جھکائے ٹکٹکی باندھے ملحقہ ٹیلے میں گھومتی پھرتی بھیڑوں کو تک رہے ہیں۔ ایک نرس برف ایسے لباس میں ان کے قریب ہی درختوں کے درمیان تنی ہوئی الگنی پر سفید سفید گیلے رومال پھیلا رہی ہے۔ نرس کا جسم بیحد دبلا ہو رہا ہے۔ کسی روز یہ بھی گیلے رومال پھیلاتی ہوئی سینی ٹوریم میں داخل ہو جائے گی۔ پھر سرخ کمبل شانوں پر ڈالے باہر نکلا کرے گی۔ اور بنچ پر بیٹھ کر اپنی نحیف گردن جھکائے' ملحقہ ٹیلے میں گھاس چرتی بھیڑوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرے گی۔ پھر کسی شام کو چپ چاپ سو جائے گی اور اس کا جسم رات کی دلگداز خاموشی میں سینی ٹوریم کے پچھواڑے دفن کر دیا جائے گا۔ برف باری کے دنوں میں سارا دن سینی ٹوریم کے دروازے بند رہتے تھے اور رات کو کھڑکی کے گدلے گدلے شیشوں میں سے بیمار روشنیاں جھانکا کرتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر قبرستان میں رات کے وقت جلنے والے مدھم لیمپوں کا خیال آ جاتا تھا۔

ایک مریض کمبل کو شانوں پر درست کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔

''ننھی پھر بیمار ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر اسے میرے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔ یعنی ان کا خیال ہے کہ وہ بھی۔ میرا مطلب ہے اسے بھی پہاڑی آب و ہوا کی ضرورت ہے۔

اس کے ساتھی مریض کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ہے۔ وہ ایک پرانے کتبے' کی مانند ہے جو کسی قبر کے سرہانے لگا ایک طرف کو جھک سا گیا ہو۔ سرد' بے جان' بے روح۔

''اس سے کیا ہو گا؟ پہاڑ کی آب و ہوا کیا کرے گی؟ اونہہ!''

شاید اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر زہر پھیل رہا ہے۔ شاید وہ اپنے پھیکے' پژمردہ ہونٹ کاٹ رہا ہے اور ماؤنٹ ویو کے لان میں

سلیٹی رنگ کی ساڑھی زرد رنگ کا لذیذ کیک کاٹ رہی ہے اور اس کے ہونٹوں میں مربے کی مٹھاس رچی ہوئی ہے۔

کل ڈیڈ بھی آ رہے ہیں۔ وہ اپنی کار پر آئیں گے۔ آہا خوب سیر کریں گے!

ہاں ہاں! خوب سیر کریں گے۔ خوب مربہ کھائیں گے۔ خوب تسبیح پھیریں گے' خوب ڈھیلے کریں گے اور خوب سر منڈوائیں گے۔

یہ کوا ابھی تک صلیب پر بیٹھا نیچے پٹھان کو کیوں دیکھ رہا ہے؟

بے حیا جانور!

سڑک پر ایک اور ٹولہ نمودار ہوا ہے۔ شاید یہ آخری موٹر سے اترے ہیں۔ برقعے' ریشمی' نیلے کالے' قرمزی' نقاب اٹھے ہوئے' گرے ہوئے' نہ اٹھے ہوئے' شلواریں' ساڑھیاں' پتلونیں' شیروانیاں' اور کوٹ چسٹر' گرم چادریں' باتیں' باتیں' اور باتیں۔ گنجے سر' چھڑیوں کے سہارے چلتے ہوئے جھکے جھکے بوڑھے جسم' دھنسی ہوئی ویران آنکھیں' سوکھے ہوئے چہرے' زرد گالوں پر ابھری ہوئی ہڈیاں' پھیکی آوازیں' پژمردہ قہقہے' سوگوار ہنسی' میدانوں کی بھیڑیں' قربانی کی بھیڑیں' گلیوں کے چوہے۔ سنگین چھتوں تلے سارا دن رجسٹروں پر جھکے رہنے والے مریض۔ بہی کھاتوں کو ساتھ لے کر تجوریوں کے سائے میں سونے والے بیوپاری' پھولی ہوئی توندیں' ہانپتے نتھنے' مٹیالے چہرے۔ اکھڑے اکھڑے سانس!

''ڈاکٹر صاحب کھانا ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتا۔''

''میاں صاحب یہ گرمیاں پہاڑ پر گزاریں''

''ڈاکٹر! اب تو ہلکی ہلکی کھانسی بھی شروع ہو گئی ہے۔''

''حضور پہاڑ تشریف لے جائیے!'' ''ڈاکٹر صاحب۔ مجھے بھوک کیوں نہیں لگتی حالانکہ ہر روز صبح شام کار پر سیر کو جانا میری عادت میں داخل ہے۔''

''ملک صاحب! سیزن پہاڑ پر کاٹیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اور اب سب ٹھیک ہو گیا ہے کیونکہ سب مریض پہاڑ پر جمع ہو گئے ہیں اور پہاڑی ایک ایئر کنڈیشنڈ ہسپتال بن گیا ہے۔ پہاڑ کی صاف ستھری ہوا میں ہزاروں بیماریوں کے جراثیم سرایت کر گئے ہیں۔ ہوائیں بیمار ہو گئی ہیں' انہیں ہلکی ہلکی کھانسی رہنے لگی ہے' اب وہ کونسے ہسپتال میں جائیں؟ وہ کس پہاڑ پر گرمیاں گزاریں؟

برقعے' پتلونیں' شلواریں آگے نکل گئی ہیں۔ اب ایک ہاتو رکشا کھینچے چلا آ رہا ہے۔ رکشے پر سامان کا انبار لدا ہے۔ ہاتو اسے بمشکل کھینچ رہا ہے۔ ایڑی چوٹی کا زور لگانے سے اس کی گردن پر رگیں تنی ہوئی ہیں اور پنڈلیوں کی مچھلیاں ابھر آئی ہیں۔ کنپٹیوں کی نسیں پسینے میں شرابور ہیں وہ کمر جھکائے' ہانپتے ہوئے یوں رکشا اوپر کھینچ رہا ہے جیسے اس پر سامان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا لدی ہے' اس دنیا کے تمام سنگین شہر لدے ہیں اور ان شہروں کے ہزاروں لاکھوں کروڑوں انسان' مٹی کے' لوہے کے سونے کے انسان سوار ہیں اور وہ اکیلا تنہا انہیں کھینچے لیے جا رہا ہے۔ یہ ہاتو انسان نہیں ہو سکتا' یہ یقیناً کوئی پہاڑی بیل ہے جو اپنے مالک کے ڈر سے بخوشی ہر کام سر انجام دے رہا ہو۔ اے بے زبان پہاڑی بیل تو صرف اس سڑک پر ہی نہیں ہے تو تین چوتھائی دنیا کے ہر شہر' ہر سڑک' ہر گلی' ہر گھر میں ہے۔ تو کتنے خلوص سے لوہے اور سونے کے آدمیوں کا بوجھ چپ چاپ کھینچے لیے جا رہا ہے۔ جب تک سڑکوں کی اونچ نیچ باقی ہے۔ جب تک دنیا میں اترائی چڑھائی موجود ہے تیری پیٹھ پر یہ ناقابل برداشت بوجھ لدا رہے گا اور تیری کمر جھکی رہے گی اور تیری پیشانی کا پسینہ تیری پنڈلیوں پر بہتا رہے گا اور تو پالتو جانور کی طرح اسی انداز میں ہانپتا' کبھی اوپر چڑھتا رہے گا اور کبھی نیچے اترتا رہے گا اور میدانوں کا پسینہ پہاڑوں کی طرف اور پہاڑوں کے پتھر میدانوں میں لڑھکتے رہیں گے جب تک کسی چشمے میں تجھے اپنے سینگوں کے نیزے دکھائی نہیں دیتے' تیرے بدن پر ہر جگہ نوکیلے سینگ نہیں نکل آتے اے کم عمر بیل! پھر تو رکشا چھوڑ کر ایک دم تن کر کھڑا ہو جائے گا اور رکشے پر لدا ہوا سارا سامان' سارا لوہا اور سارا سونا نیچے میدانوں کی طرف لڑھک جائے گا اور پھر پہاڑوں پر بہت بڑا لینڈ سلائیڈ ہو گا اور چٹانیں ٹوٹ کر وادیوں میں گر پڑیں گی اور ہر شے ہموار ہو جائے گی' ہر شے ٹھیک ہو جائے گی' پھر کھانا بھی ہضم ہوا کرے گا' پھر بھوک بھی خوب چمکا کرے گی۔ لیکن ابھی نہیں' ابھی جس چشمے میں تجھے اپنے سینگوں کے نیزے دیکھنے ہیں اس کا پانی گدلا ہے اور اس کی سطح ناصاف ہے۔ ابھی ٹیمز کافی ہاؤس اور ماؤنٹ ویو کے درمیان گرجا حائل ہے اور گرجے کے صحن کو خاردار جنگلے نے گھیر رکھا ہے۔ ابھی پٹھان نے ڈھیلا کرنا ختم نہیں کیا اور چنار کے تنے سے ٹیک لگائے بوڑھا کشمیری آنکھیں بند کئے تسبیح پھیر رہا ہے اور میرا پائپ بجھ گیا ہے۔

کافی بھی تو ختم ہو گئی ہے۔ ٹیمز کی کافی کتنی خوشگوار ہے اور خاص طور سے کریم کا ذائقہ تو بے حد لذیذ ہوتا ہے۔

بیرا۔ بیرا کافی اور لاؤ۔

''بہت اچھا صاحب!''

صاحب بہت اچھا ہے مگر پٹھان بیرا بہت اچھا نہیں ہے۔ وہ آخری کھڑکیوں والی میز کے گرد بیٹھے خاموش گاہکوں سے جھک کر

ٹپ لے رہا ہے اور سلام کرنے کے بعد دانت نکالے احمقوں کی طرح ہنس رہا ہے۔ ہنسو ہنسو ہنسنا ہی زندگی ہے مگر کمر مت جھکاؤ۔ اس کی مضبوط کمر میں یہ لچک کس نے پیدا کر دی ہے۔ بخشش کی دونی نے؟ یہ دونی اس قدر وزنی ہے کہ اٹھاتے ہوئے آدمی کی کمر جھک جاتی ہے؟ اگر اس بیرے کو جھکنا ہی تھا تو یہ اس قدر تنومند کیوں تھا؟ دیودار کے درخت تو کبھی نہیں جھکتے۔ وہ اکھڑ جاتے ہیں مگر سر نہیں جھکاتے۔ شاید یہ دیودار نہیں بید مجنوں ہے۔ لیکن مجھے اس سے کیا' وہ بید مجنوں ہو یا بید لیلیٰ' مجھے پائپ سلگانا چاہیے۔ ابھی کوئی دم میں گرم گرم کافی آنے والی ہے۔ آج تو کافی کا فلیور غضب کا ہے۔ وہ پہاڑی بیل رکشا سمیت اوپر چوک میں پہنچ گیا ہے۔ یہاں سے وہ کسی پتلی سی پہاڑی سڑک پر ہو جائے گا اور درختوں کے سایوں میں کسی سپرنگ لاج' پائن ٹاپس یا سنو ولا کے آگے رکشا روک لے گا اور کسی پتھر پر بیٹھ کر پسینہ پونچھے گا' قمیض سے ہوا کرے گا' اور پھر سارا سامان ایک ایک کر کے اندر لے جائے گا۔

اوا سے کس طرح اٹھاتا ہے۔ ڈیم فول یہ ریڈیو ہے اور تم بالکل گدھا ہے۔

اور جب صاحب بہادر گدھے کے ہاتھ میں چونی دے گا تو گدھے کو ساری دنیا قوس قزح کے رنگوں میں ڈھلتی نظر آئے گی اور گدھا خوشی خوشی اپنے گھر کی راہ لے گا اور پھٹا ہوا نمدہ اٹھا کر بیوی سے کہے گا۔

"یازبو! اری دیکھ میں کیا لایا ہوں۔ اٹھ چائے تو بنا دے۔"

نیاز بو' گندے فرن اور جمے ہوئے بدبودار بالوں والی نیاز بو! کشمیر کی شہزادی اپنے سرتاج کے لیے ٹین کے سیاہ کالے ڈونگے میں پانی گرم کرنا رکھ دے گی۔ گیلی جھانگڑیاں سلگنے لگیں گی۔ پھونکیں' دھواں' کھانسی' موت!

یہ لوگ کتنی جلدی دنیا کے دکھوں سے نجات پا جاتے ہیں۔ خوش قسمت لوگ!

کافی ہاؤس میں کچھ اور لوگ آ کر ادھر ادھر بیٹھ گئے ہیں۔ گنجے سر والا مدقوق آدمی بدستور خاموش نگاہوں سے سڑک پر کنارے والے درختوں کو تک رہا ہے۔ چیچک کے داغوں والا اس کا ساتھی اس دوران میں کئی بار ناک صاف کر چکا ہے اور بیرے کی آنکھ بچا کر کرسی کے پیچھے تھوک چکا ہے۔ میرے ساتھ والی میز پر ایک سندھی تاجر بغیر پھندنے کی گہری سرخ ٹوپی والا سر ہلا ہلا کر اپنے پنجابی بیوپاری دوست سے تازہ ترین تجارتی حالات پر تبصرہ فرما رہا ہے۔ پنجابی بیوپاری سندھی تاجر کی پیالی میں کریم انڈیلتے ہوئے بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا ہے۔ کون کہتا ہے کہ سندھی اور پنجابی آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ کافی ہاؤس میں تو اس وقت وہ دو بھائیوں کی طرح بیٹھے ہیں جن کا آپس میں کوئی اختلاف نہ ہو جو ہر بات پر متفق ہوں۔ سندھی تاجر کی سانولی رنگت میں ہلکے نیلے پن کی آمیزش ہے۔ اس کی گول گول آنکھیں ایسے پتھر ہیں جو کسی جوہڑ کی تہہ میں پڑے ہوں' سرد اور بے حس!

''سالا اب کراچی مارکیٹ بھی ڈاؤن ہو رہا ہے۔ لاہر (لاہور) مارکیٹ تو ایک دم گر گیا ہے۔ کھال اور سوڈے کا بھاؤ کھیال ہے اور ابھی چڑھے گا۔ سالا ہمارے پاس تو اس کا کافی سٹاک جمع ہے' ابھی اور اسٹاک کرے گا۔

کرے گا۔ ضرور سٹاک کرے گا' ابھی سالا ایبل کو سینگ کو سینگ نہیں لگا' ابھی کشمیری ہاتو نے تسبیح لپیٹ کر آنکھیں نہیں کھولا۔ ابھی ضرور سٹاک کرے گا۔ لیکن کھیلا ہے کہ جلدی ہی بہت بڑا لینڈ سلائیڈ ہوگا اور سالا ایبل کو سینگ لگ جائے گا پھر سٹاک نہیں کرے گا' پھر کبھی سٹاک نہیں کرے گا۔

کاؤنٹر کے پاس والی میز پر ایک اچکن پوش بزرگ کے سامنے ایک برقع پوش خاتون بیٹھی چپس کھا رہی ہیں۔ محترمہ نے نقاب الٹ رکھا ہے۔ لیکن منہ پر پھیلے ہوئے مہاسوں کے بدنما دھبے پوری طرح دکھائی نہیں دے رہے۔ صرف ایک آنکھ میں دنبالہ دار کاجل کی مڑی ہوئی لکیر اور تھوڑا تھوڑا امنڈا ہوا ابرو دکھائی دے رہا ہے۔ یہ آنکھ شاید پتھر کی ہے کیونکہ بالکل حرکت نہیں کر رہا اور دیر سے میز والے راکھ دان کو دیکھ رہا ہے۔ محترمہ کی آواز میں بلا کا بدھاپن ہے۔

''تاج کے ابا! یہاں تو سردی نے برا حال کر رکھا ہے۔ اور یہ تلے ہوئے آلو ہیں کیا؟

توبہ! ان میں یہ بو کیسی ہے؟ ہائے میں تو خواہ مخواہ پہاڑ پر آ گئی۔

محترمہ! صرف آپ ہی نہیں آپ کا خاوند بھی خواہ مخواہ آ گیا ہے۔ ہر شخص یہاں خواہ مخواہ آ گیا ہے۔ انہیں ہسپتالوں میں جانا چاہیے تھا۔ پہاڑوں پر عظیم بلندیوں پر اگنے والے پر اسرار جنگل' چنار اور چیڑ کے مرطوب سایوں میں سے لہرا کر گزرتی ہوئی نازک پگڈنڈیوں' سپید' گلابی' سرخ اور ہلکے زرد پھولوں' شگوفوں اور غنچوں سے لدے پھندے آلوچے' ناخ' سیب اور بگنگ کے درخت۔ ہری ہری ناز بیلوں کے گھونگھٹ میں چھپے ہوئے انگوروں کے قرمزی گچھے' پتھروں پر سے اچھلتا ہوا چشموں کا شفاف پانی' برف آلود چوٹیوں پر منڈلانے والے دودھیا بادل' رات کے ماتھے پر ستاروں کے جھومر' بے داغ اور پاکیزہ ہوا' پھولوں کی پتیوں کی مانند گرتی ہوئی برف کی پر اسرار سرگوشیاں' کافی ہاؤس کی کھڑکیوں میں سے اندر داخل ہونے والے بادلوں کی مرطوب دھند۔ یہ چیزیں ان کھوکھلے' بے روح اور بے حس آدمیوں کے لیے نہیں ہیں۔ یہ بیمار اور روگی ہیں۔ انہیں تو اس وقت آنا چاہیے تھا جب یہاں کی ہر شے برف میں چھپی ہوئی تھی۔ جب ہر طرف برف ہی برف تھی' سرد' بے جان اور منجمد برف' جب اس پہاڑ پر کسی بڑے ہسپتال کی نرس کا شبہ ہوتا تھا۔ اس وقت نرس بیماروں کی خاطر خواہ تیمارداری کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ ڈیوٹی پر تھی۔ لیکن اب تو نرس نے اپنا برف ایسا سرد لباس اتار کر رنگ برنگ پھولوں والی ریشمی ساڑھی پہن لی ہے اور وہ دوشیزہ بہار کے ساتھ خیابانوں میں گشت کر رہی ہے۔ اب یہ لوگ یہاں

کیا کرنے آئے ہیں۔

سالا پہاڑ کا مارکیٹ بھی ایک دم گر گیا ہے۔

نچلے بازار کی پیچ در پیچ پتھریلی اور ڈھلوانی گلیوں میں دوکانیں کھل رہی ہیں۔نائیوں' کنجڑوں' بساطیوں' دھوبیوں' پکی روٹی پکی روٹی اور فلمی گانوں کے پلاٹ بیچنے والوں کی دوکانیں' گائے' بکرے اور مرغی کا گوشت بیچنے والوں اور رنڈیوں کی دوکانیں گوشت بیچنے والوں کے ساتھ ہی ہیں۔ یہاں پہنچنے کے لیے ایک لمبے ڈھلوائی بازار کو عبور کر کے دوسرے بازار میں سے گزرتے ہوئے ایک تنگ وتاریک گلی میں جانا پڑتا ہے۔اس گلی میں بے حد سیل ہے۔یہاں ہر وقت عجیب قسم کی بو پھیلی رہتی ہے۔جیسے قریب ہی کسی مردہ کو نہلایا جا رہا ہو یا اسے مشک کا فورلگ رہا ہو۔ یہاں جھکے ہوئے شکستہ مکانوں کے چھجے نیچے کی طرف مڑ گئے ہیں اور مسواک اور کھریا مٹی کی مدد سے ہر دوکان کے دروازے پر وہاں بیوپار کرنے والی کا نام لکھا ہوا ہے۔کمیٹی والے اس گلی کی نالیاں صاف کرا رہے ہیں۔ رنڈیوں کی صحت کا بھی کمیٹی کو خیال رکھنا پڑتا ہے۔ آخر وہ بھی تو ٹیکس بھرتی ہیں۔لیکن کمیٹی کی صفائی اور سطح سمندر سے کئی ہزار فیٹ کی بلندی پر رہنے کے باوجود ہر عورت کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے موجود ہیں۔ہونٹ خزاں نصیب پتیوں کی طرح مرجھا کر سوکھ گئے ہیں اور چہرے پر مفلسی اور بیماریوں کے منحوس سائے منڈلاتے رہتے ہیں۔

اس گلی کی سیڑھیاں اتر جانے پر دوسری طرف جلے ہوئے مکانوں کا ویران سلسلہ ہے۔ان بغیر چھتوں اور بغیر دروازوں کے مکانوں میں ڈلہوزی' چمبہ' میسوری اور نینی تال سے آئے ہوئے پہاڑی مزدوروں نے اپنے گھر بنائے ہوئے ہیں۔ان گھروں میں وہ اپنے پرانے لحافوں گھاس بھوس کے بستروں' مٹی اور ٹین کے برتنوں اور اپنی بھوکی ننگی بچیوں اور بیویوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ٹین کے جھولتے ہوئے چھپر' ننگے پاؤں' پھٹے ہوئے ہاتھ پاؤں۔ٹھنڈے لحاف' ٹھنڈے چولہے' دھوآں' دھوآں۔مرد صبح کو اپنی عورتوں سے لڑجھگڑ کر باہر نکل آتے ہیں اور موٹروں کے اڈوں پر اس انتظار میں جا بیٹھتے ہیں کہ کوئی لاری آئے اور وہ اپنے مالک کا سامان اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔وہ رات کو تھک ہار کر گھر لوٹ آتے ہیں اور اگر کوئی مزدوری نہ ملی ہو تو پھر لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ایک گھر' ایک جہنم۔اور یہاں کئی جہنم ہیں ان آباد کھنڈروں کی شکستہ دیواروں سے جب رات کو سرد ہوائیں اپنا سر ٹکراتی ہیں تو ایک دردانگیز شیون سا بلند ہوتا ہے۔جھولتے ہوئے چھپر شور مچانے لگتے ہیں اور پھٹے ہوئے لحاف میں گھسا ہوا پورا خاندان ٹھٹھرنے لگتا ہے۔بچے رونا شروع کر دیتے ہیں۔عورتیں انہیں چپ کراتی ہیں۔مرد پہلو بدل کر فحش گالیاں سناتے ہیں۔

بھوکے جانور ٹھٹھرتے رہتے ہیں اور تیز ہواؤں کا شیون بلند سے بلند تر ہو جاتا ہے۔وہ کھنڈرات سے ٹکرا کر چیختی ہیں' چلاتی

ہیں۔

شاں اوشاں شاں۔

آ 'ؤ' آ ؤ آ ؤ۔ نکلو نکلو باہر آ ؤ باہر نکلو۔ میں تمہیں ہمیشہ جگاتی رہوں گی۔ میں تمہیں کبھی نہ سونے دوں گی۔ تاوقتیکہ تم پھٹے ہوئے لحاف جلانہ دو اور دیواروں کو ڈھانہ دو اور باہر نہ نکل آ ؤ۔

آ ؤ آ ؤ شاں شاں!!

ہواؤں کا یہ پیغام وہ روز سنتے ہیں اور ایک دوسرے کو فحش گالیاں دے کر پھر سو جاتے ہیں۔ لیکن یہ پیغام کھنڈرات سے چل کر کالج ماؤنٹ ویو تک پہنچ کر بالکل تبدیل ہو جاتا ہے۔ پہاڑی ہوائیں سرد آہوں کی مانند گزرتی ہیں۔ یہاں ان کا شور خواب آلود لوریوں میں بدل جاتا ہے۔

سو جاؤ' سو جاؤ' یہی وقت سونے کا ہے' باہر چنار اوس میں بھیگ گئے ہیں اور اندر آتشدان میں آنچ مدھم پڑ گئی ہے۔ اور نیند کی پریاں اپنے پر پھیلائے سو گئی ہیں۔

سو جا' سو جا' راجکماری سو جا۔

آباد کھنڈروں میں کبھی کبھی رات کو مٹی کے دیئے ٹمٹمایا کرتے ہیں اور اوپر والی گلی میں رنڈیوں کی دکانیں بجلی سے بقعہ نور ہوتی ہیں۔ یہ تیز روشنی مٹی کے مدھم دیوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ان پناہ گزین کنبوں سے کئی دیے ان منور دوکانوں میں آ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ چکے ہیں۔ ان دیوں میں جب تیل ختم ہو جاتا ہے اور بجلی کے قمقمے روشن ہو اٹھتے ہیں۔ دیے ہر روز بجھتے ہیں اور بجلی کے قمقمے ہر رات جلتے ہیں اور یہی قمقمے ماؤنٹ ویو میں بھی رات کو روشن ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے ذرا نیچے روشن ہوتے ہیں اور دوسرے اوپر ٹیلے پر جا کر اور ماؤنٹ ویو میں ان قمقموں کی مختلف قسم کے شیڈز سے ڈھانپا جا سکتا ہے۔ پھر ان کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ جیسے چوری چھپے سہمے سہمے جل رہے ہوں۔ ان بازاروں اور تنگ پتھریلی گلیوں کے آخر پر جا کر نیچے وادیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دور کئی ایک جگہوں پر درختوں کے جھنڈوں کے درمیان سفید مٹی سے پتے ہوئے مکان سنہری دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر کھیتوں کی ہری بھری سیڑھیوں پر کہیں کہیں اکا دکا کسان ہل چلا رہے ہیں۔ اوپر سے دیکھنے پر وہ بالکل کھلونا معلوم ہو رہے ہیں۔ جس میں کوک بھر دی گئی ہو اور جو خود بخود آہستہ آہستہ حرکت کر رہے ہوں۔ جموں کے ابھرتے ہوئے سلسلہ ہائے کوہ ہیں' جن کی برف آلود چوٹیاں دھند میں ڈوبی ہوئی ہیں' ماؤنٹ ویو کالج کے لان میں بیٹھی ہوئی تینوں لڑکیاں شام کی چائے پی

چکی ہیں۔موٹی خادمہ برتن اندر لے گئی ہے۔بھڑ کیلے رنگ کے غرارے والی دبلی پتلی لڑکی نرم گھاس پر خراماں ٹہل رہی ہے۔
دھوپ کا رنگ گہرا سنہری ہو کر نارنجی چمک اختیار کر رہا ہے۔مغربی پہاڑیوں کی غیر ہموار چوٹیوں پر منڈلانے والے دودھیا بادل شفق کی آگ میں ڈوب کر لالہ گوں ہو رہے ہوں۔سیب کی ڈالیاں مرطوب اندھیروں کا لمس محسوس کر کے سمٹ سی گئی ہیں۔لڑکی دھیمے دھیمے سگریٹ پی رہی ہے۔اس کے مدور شانوں پر جھولتے ہوئے بھورے بالوں کے گچھوں میں ڈوبتے سورج کی ترچھی کرنیں آگ سی لگا رہی ہیں۔ساٹن کی شلوار والی لڑکی لان کے پرلے کنارے پر ایک سنگین چبوترے پر کھڑی ذرا جھک کر نیچے پتلی لمبی سڑک کو دیکھ رہی ہے جو چیڑھ کے درختوں کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی اوپر سینی ٹوریم کو چلی گئی ہے۔سرخ دوپٹے والی لڑکی نے پھر سے اخبار کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔اس کا سگریٹ اس کی نازک اور لمبی انگلیوں کے درمیان سلگ رہا ہے اور اس کی نگاہیں اخبار پر چھپی ننھے ننھے الفاظ کا تعاقب کر رہی ہیں۔

برطانیہ میں زبردست مالی بحران' امریکہ نے مزید قرضہ دینے سے انکار کر دیا۔برطانیہ نے پونڈ کی قیمت کم کر دی۔تیسری جنگ عظیم کی تیاریاں' حفاظتی کونسل نے تین اور ملکوں کو جنگی سامان دینے کا فیصلہ کر لیا' ڈالر قرضے' ہڑتالیں' قحط' وبائیں' بھوک' جنگ۔

وال سٹریٹ میں کاٹن کا بھاؤ چڑھ گیا' سن ۱۹۶۰ء میں بوئی جانے والی فصل کا سودا ہو رہا ہے۔فلسطین کے لاکھوں مہاجر عرب کی سرحدوں پر بھوکوں مر رہے ہیں اور امریکہ نے تیس ٹن زائد گندم سمندر میں بہا دی ہے اور وال سٹریٹ میں سونے کا بھاؤ تیز ہو رہا ہے۔
سٹاک کرو' سٹاک کرو' ہیلو! ہیلو! سارا سونا خرید لو!

ہم بھوکے ہیں' ہم ننگے ہیں' ہم انقلاب چاہتے ہیں۔

خرید لو! خرید لو! خرید لو!

یہ ہماری زندگیوں کا سوال ہے۔

بیچ دو! بیچ دو! ہیلو! ہیلو!

وال سٹریٹ نے زمین کی طنابیں کھینچ لی ہیں' دھرتی کا سارا رس چوس لیا ہے' ٹیلیفون پر ملکوں کے سودے ہو رہے ہیں۔چشمے سوکھ رہے ہیں' زمینیں بنجر ہو رہی ہیں' کھیتوں میں دھول اڑ رہی ہے ہر طرف موت ایسی ویرانی' جمود' خاموشی' سناٹا طاری ہے۔وال سٹریٹ میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور مشرق کی ہر گلی پر قبر کی لحد کا گمان ہوتا ہے۔

وال سٹریٹ' کال سٹریٹ' ڈیم وڈیو!

اب شام کے مرطوب سائے وادیوں میں اترنے لگے ہیں اور سورج مغربی کناروں پر سرمئی غبار چھوڑ کر پہاڑیوں کی اوٹ میں چھپ گیا ہے۔ کھائی کے کنارے ڈھیلا کرنے والا پٹھان چلا گیا ہے اور گرجے کی صلیب پر بیٹھا ہوا بے حیا جانور بھی اڑ چکا ہے۔ نائی اپنے گاہک کا سر مونڈ کر استرے' قینچیاں چمڑے کے تھیلے میں بند کر رہا ہے۔ بوڑھا کشمیری تسبیح خوانی کے بعد ڈھلوان کے پتھروں پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا نیچے سڑک پر اتر رہا ہے۔ سینی ٹوریم کے باہر بیٹھے ہوئے سرخ کمبلوں والے لاغر مریض اندر جا چکے ہیں۔ ہسپتال کی تمام کھڑکیاں بند ہیں۔ گرجا گھر کے دروازے پر انگوروں کی بیل کا گھونگھٹ لحظہ بہ لحظہ تاریک ہو رہا ہے اور قرمزی انگوروں کے گچھے سیاہ دھبوں کی مانند نظر آ رہے ہیں۔ بنچ کی باڑھ سے اوپر گھاس چرتی بھیڑوں کو ایک کمسن لڑکی سونٹی سے ہنکائے اوپر لیے جا رہی ہے۔ نچلے بازار میں شور دھیما پڑ رہا ہے۔

ماؤنٹ ویو کا لان ویران ہے۔ غرارہ' شلوار' دوپٹہ' کوئی نہیں اب وہاں کوئی نہیں۔ تپائی پر گل دان میں آلوچے کی لمبی پھول دار ٹہنیاں اوس میں بھیگ رہی ہیں۔ لڑکیاں خواب گاہ میں جا چکی ہیں۔ کمروں کے تمام دروازے بند کر لیے گئے ہیں۔ باہر سردی بڑھ رہی ہے۔ اوس گر رہی ہے اور اندر آتشدان میں آگ سلگ اٹھی ہے۔ کھڑکیوں پر ریشمی پردے گرا دیے گئے ہیں۔ خواب گاہ کے دریچوں اور روشندانوں سے نکلتی ہوئی مدھم سبز روشنی میں گھاس پر رینگنے والی مرطوب دھند اجاگر ہو رہی ہے۔ ہوا ٹھنڈی ہو گئی ہے اور اس میں جنگلی پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ ہر سانس زندگی کا اولین سانس محسوس ہو رہا ہے۔ سڑک کے کنارے دور دور کھڑے بجلی کے کھمبوں پر بتیاں جل اٹھی ہیں۔ ادھر اوپر نیچے' سپرنگ لاج ہل ویو' پائن ٹوپس' اور سینی ٹوریم کے بند کھڑکیوں اور روشندانوں پر قبرستان میں جلنے والے لیمپوں کا شبہ ہو رہا ہے۔

چنار کے درخت شروع شب کے سایوں میں دھندلے' ویران اور خاموش ہیں۔ مرغزاروں میں ملائم دھندسی اٹھنے لگی ہے۔ چیڑ اور صنوبر کے جنگلوں میں سناٹا طاری ہے۔ ان جنگلوں میں خاموش اور بے زبان زندگی کا آغاز ہو رہا ہے' وہ زندگی جو دن کے اجالوں میں نظروں سے اوجھل تھی رات کے ویران سناٹوں میں بیدار ہو گئی ہے اور شگوفوں کا منہ چوم رہی ہے اور اس کا پرسکوں لمس انہیں خوشبو رنگ اور حسن سے مالا مال کر رہا ہے۔ ماؤنٹ ویو کے دریچے نیم روشن ہیں۔ وہ تینوں لڑکیاں اندر کیا کر رہی ہوں گی؟ زمین سے کئی ہزار فیٹ کی بلندی پر جب باہر سرد رات میں اوس گر رہی ہو اور نیلے آسمان پر ستارے ٹھٹھر رہے ہوں تو گرم خواب گاہوں میں آتشدان کے قریب قالین پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں بے حد حسین معلوم ہوتی ہیں۔ پھر دھیمی آوازوں میں ان سنے گیتوں کے سر جاگ اٹھتے ہیں۔ گرم دھندلکوں میں بوجھل پلکوں تلے محبت کی چمکیلی قندیلیں فروزاں ہو جاتی ہیں اور گرم اور لوچ دار جسم پتوں میں چھپے ہوئے

پھول بن کر مہکنے لگتے ہیں اور پھر روشنیاں ڈوبنے لگتی ہیں' اندھیروں کے نرم و ملائم ہاتھ پیشانی کو چھوتے محسوس ہوتے ہیں' قندیلیں بجھنے لگتی ہیں' ان سنے گیتوں کے سرخواب آلود سایوں میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور آتشدان میں آگ مدھم پڑ جاتی ہے۔ بتیاں گل ہو جاتی ہیں اور ہر سمت خاموشی چھا جاتی ہے۔ اور باہر نیلے ستاروں کی چھاؤں میں کائنات کا رقص تھم جاتا ہے' پھول سو جاتے ہیں' گیت سو جاتے ہیں' کھو جاتے ہیں' ڈوب جاتے ہیں' مر جاتے ہیں۔

اٹھو اٹھو...... میں تمہیں جگانے آئی ہوں!

سو جاؤ' سو جاؤ' یہ سونے کا وقت ہے۔

ہواؤں کا یہ پیغام ماؤنٹ ویو سے لے کر نچلے بازار کی رنڈیوں کے ڈربوں تک گونجتا رہتا ہے۔ جلے ہوئے کھنڈروں میں بسنے والے کشمیری کنبوں تک یہ پیغام پھٹے ہوئے نمدوں سے ہو کر پہنچتا ہے اور اس کی ڈراؤنی آواز پر غلیظ لحاف میں ٹھٹھرتے ہوئے بچے ڈر کر رونے لگتے ہیں۔ مائیں انہیں مارتے ہوئے چپ کراتی ہیں اور مرد ٹوٹتی نیند میں فحش گالیاں بکنے لگتے ہیں۔ دن بھر سامان سے لدا ہوا رکشا کھینچنے اور رات کو تنگ و تاریک کوٹھری میں نیازبو کی آغوش میں پھوس پر سو جانے والا با تو' بے زبان نیل یہ پیغام نہیں سنتا۔ ہوائیں دروازے سے سر پٹخ رہی ہیں۔

اٹھو! اٹھو! سو سالہ نیند میں ڈوبے ہوئے نیل اٹھو! یہ اٹھنے کا وقت ہے!!

اور نیل کسی وقت نیند میں بڑبڑا اٹھتا ہے۔

پونسہ صاحب! بخشیش صاحب!

نیل سو رہا ہے۔ وہ گہری نیند میں کھویا ہوا ہے۔ میلے کچیلے فرن والی نیازبو اس کی آغوش میں ہے' نیچے گرم گرم پھوس ہے اوپر پھٹا ہوا لحاف ہے۔ اس کے اوپر جھکی ہوئی سیاہ چھت ہے اور چھت کے اوپر ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔ درمیان میں کافی ہاؤس ہے۔ سندھی تاجر' گرجا گھر ہے' خاردار جنگلہ ہے' نیل کو ان سب سے گزر کر ماؤنٹ ویو تک جاتا ہے' ماؤنٹ ایورسٹ تک پہنچنا ہے۔ اور نیل سو رہا ہے۔ سونے دو' سونے دو۔

سو جا' گنجی کھوپڑی اور چپٹے تلوؤں والے نیل سو جا!

کافی ہاؤس تقریباً خالی ہو چکا ہے۔ سردی بڑھ رہی ہے۔ میرا پائپ بجھ گیا ہے۔ کھلی کھڑکی میں سے اوس میں بھیگی ہوئی سرد ہوا میری پیشانی اور شانوں کو چھو رہی ہے۔ پتھر کے ڈھیلے والی محترمہ کی میز خالی ہے۔ سندھی اور پنجابی تاجر لاہور اور کراچی کی مارکیٹیں

ڈاؤن کر کے جا چکے ہیں۔ ماؤنٹ ویو کو کہرے کی لطیف چادر نے ڈھانپ رکھا ہے۔ بند دریچوں میں روشنیاں بجھ چکی ہیں۔ تینوں لڑکیاں سو رہی ہوں گی۔ ان کی آنکھیں بند ہوں گی' یاقوتی ہونٹ نیم وا ہوں گے اور گرم لحافوں کے اندر ننھے منے دل کی دھڑکنیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں گی۔ میری پلکیں کیوں بوجھل ہو رہی ہیں؟ میرے خیال میں مجھے اب چلنا چاہیے۔ مجھے بھی سو جانا چاہیے۔

سو جا' سو جا اے پڑھے لکھے بیل! تو بھی سو جا!!

قصہ حاتم طائی کے لاہور آنے کا

جب حاتم طائی حسن بانو کے ساتوں سوال پورے کر کے اسے اپنے نکاح میں لے آیا اور ہنی مون ان پر ایک مرتبہ طلوع ہو کر ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا تو انہیں اقتصادی مشکلات نے آن گھیرا۔ حسن بانو کی سینڈل گھس گئی اور برقعے میں جگہ جگہ پیوند لگ گئے۔ بغداد کے اخراجات برداشت سے باہر تھے۔ حاتم طائی نے اپنے تمام اونٹ مہمانوں کو کھلا ڈالے اور خود ایک مقامی روزنامے میں بحیثیت نیوز ایڈیٹر ملازم ہو گیا۔ حسن بانو نے اس دوران میں ٹائپ سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک ہوٹل میں کام پر لگ گئی۔ دن کو تو ہوٹل میں کام کرتی اور رات کو ہر دوسرے تیسرے ریڈیو سٹیشن پر عربی موسیقی کا پروگرام براڈکاسٹ کرتی۔ حاتم طائی کو بھی دفتری کام کے علاوہ ریڈیو سٹیشن پر "بغداد ہمارا ہے" کے پروگرام میں حصہ ملنے لگا۔ اختیاطاً اس نے مہمانوں میں مفت کھانا بانٹنا اور فقیروں کو خیرات دینا ترک کر دیا تھا پھر بھی گھر کے اخراجات پورے ہونے میں نہ آتے تھے۔ علاوہ ازیں عمر کا کافی حصہ خانہ بدوشی اور ملک ملک کی سیر میں گزار چکنے پر اس کے پاؤں ہر رات بستر میں جلتے رہتے تھے۔ ایک رات کیا ہوا کہ ریڈیو پر ملک کی اقتصادی حالت کا پرانے بغداد سے موازنہ کرتے ہوئے جب حاتم نے پر تکلف کھانوں اور شراب کی فراوانی کا ذکر کیا تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ چنانچہ اسے ریڈیو کی ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔ حسن بانو کے ساتھ بھی اسی قسم کا حادثہ پیش آیا۔ وہ ریڈیو پر "شبھ بلاول" گا رہی تھی کہ اسے چھینک آ گئی۔ اس نے عالم خیال میں اپنے حاتم کو بحرین کے صحراؤں میں پانی پانی چلاتے سنا اور فوراً گیئر بدل کر میاں جی اور بی بی جی کی ملہار ایک ساتھ شروع کر دی۔ آن کی آن میں بغداد میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور ریڈیو گھر کی عمارت دجلہ کی طرف بہہ نکلی۔ بصد مشکل کہیں ریڈیو کے ڈائریکٹر نے دیپک کے سر الاپے اور ملہار بھاپ بن کر اڑی۔ لیکن حسن بانو کے لیے ریڈیو کے دروازے بند کر دیئے گئے۔

اسی دوران میں چند لاہوری حاجی حج بیت اللہ سے فراغت پا کر پرانے امریکن کوٹ خریدنے بغداد پہنچے۔ حاتم طائی کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ حاتم نے انہیں قہوے کی دعوت دی مگر لاہوری حاجیوں نے دہی کی لسی پر اصرار کیا۔ لسی پی کر انہوں نے حاتم کے سامنے شہر لاہور کی تعریف کے وہ پل باندھے کہ حاتم کا دل ان پلوں پر سے گزر کر لاہور پہنچنے کو بے تاب ہو گیا۔ اس نے حسن بانو سے

مشورہ کیا۔ جدائی کی خبر سن کر وہ نیک بی بی پہلے تو رو پڑی اور پھر مسکرانے لگی۔ حاتم طائی نے پوچھا۔

"نیک بخت تو پہلے روئی اور پھر ہنسی کیوں؟"

نیک بخت نے جواب دیا۔

"پیارے حاتم! میں روئی اس لیے تھی کہ جدائی کا صدمہ دل پر شاق گزرا تھا اور ہنسی اس لیے کہ مجھے تمہاری عدم موجودگی میں دوسروں سے محبت کی پینگ بڑھانے کا موقع مل جائے گا۔"

حاتم طائی نے آگ بگولا ہو کر کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو میں بھی لاہور جانے سے پہلے گھر میں ایک ایسا طوطا چھوڑ جاؤں گا جو بعد میں مجھے تیری حرکتوں کا رتی رتی حال بتا دے گا۔"

حسن بانو اپنے خاوند سے لپٹ گئی۔

"پیارے میں تو تجھ سے مذاق کر رہی تھی"

حاتم نے کہا۔

میں بھی تو Serious نہیں تھا۔

حسن بانو چونک پڑی۔

پیارے یہ نیا لفظ تم نے کہاں سے سیکھا ہے؟

پیاری اخبار کے دفتر سے۔ اور بھی لفظ سیکھے ہیں جو لاہور کے سفر میں کام آئیں گے۔

حاتم نے سامان سفر باندھا اور ابھی رخت سفر اٹھایا نہیں تھا بلکہ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ حسن بانو نے آبدیدہ ہو کر کہا۔

"پیارے جدا ہونے سے پہلے ایک درد بھرا گانا سنا دو۔"

اس پر حاتم طائی نے گلا صاف کرنے کے لیے ایک ٹکیا وکس کی کھائی اور ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر دوسرا حسن بانو کی طرف بڑھا کر تین تال میں جے جے ونتی کا خیال خام الاپنا شروع کر دیا۔ گانا ختم کر کے اس نے حسن بانو کی ناک پر بوسہ دیا اور جیب سے ایئر نگل کر گھوڑے کو دکھائی اور گھوڑا حاتم سے باتیں کرنے لگا۔

وارد ہونا حاتم طائی کا شہر لاہور میں

راوی کا اصرار ہے کہ لاہور کی صفت بیان کی جائے۔ لاہور! اسٹیشن سے شروع ہو کر سٹیشن تک پھیلا ہوا یہ شہر جنگ شروع ہونے سے پہلے ٹمبکٹو میں آباد تھا۔ جنگ کے بعد یہ بھی واپس لوٹا اور شاہدرہ کے قریب آباد ہو گیا۔ اس کے باہر ایک گندہ نالہ بہتا ہے جس کا نام راوی ہے۔ راوی' لہروں کی روانی' پانی کی کہانی اور وہ بھی اس کی اپنی زبانی۔

لو آج چلی ٹھوکریں کھانے کو جوانی

(پیارے قارئین کرام! السلام علیکم! معاف کیجئے ہمیں یہ شعر بہت پسند ہے۔ کہیے مزاج کیسا ہے۔ افسوس کہ ہم بھٹک گئے ہیں۔ اے داستان گو خدا کے لیے ہمیں اصل قصہ سنا اور اس فضول جھک جھک سے نجات دلا۔ لیجئے پیارے قارئین ہمیں فضول جھک جھک سے نجات مل گئی اور ہم اصل قصے کی طرف آ گئے)

لاہور میں ہلکی ہلکی ساون کی جھڑی لگ رہی تھی۔ شہر سے باہر کوٹھیوں میں سکھیوں نے جھولے ڈال رکھے تھے۔ شہر کے اندر مکھیوں نے حملہ کر رکھا تھا کہ ہمارا ہیرو حاتم طائی دیس دیس کی خاک چھانتا (یاد رہے چلنے سے پیشتر اس نے بغداد میں ایک چھلنی خریدی تھی) لاہور ریل گھر پہنچا۔ اس نے گھوڑے کو پانی پلانے کے لیے انجن یارڈ میں بھجوا دیا اور خود باہر سڑک پر کھڑے ہو کر شہر کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک ایک طرف سے نوجوانوں کی ایک ٹولی نے اسے گھیر لیا' ایک نوجوان' جس کی گردن اس کے کندھے پر طوطے کی گردن کی طرح جھول رہی تھی' گویا ہوا۔

"حاتم طائی! ہمیں بتاؤ کہ لاہور کے متعلق تمہارے جذبات کیا ہیں؟"

جب حاتم کو پتہ چلا کہ یہ ٹولی نامہ نگاروں کی ہے تو وہ بولا۔

"اے کاغذی نمائندو! شہر دیکھنے سے پیشتر شہر کے متعلق کیا رائے قائم کر سکتا ہوں؟"

اس پر ایک نمائندے نے پان چباتے ہوئے کہا۔

جناب ہمیں بیان دیجئے۔ کاپی پریس میں جا رہی ہے۔ ہمیں آج کے لیے کوئی سٹوری چاہیے۔ آپ شہر بعد میں دیکھتے رہئے گا۔

اور حاتم نے ایک سٹوری لکھوانا شروع کر دی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شہر لاہور کے سٹیشن پر ایک شخص نے کہا کہ میں بھی تو.........."

اور کاغذی نمائندے تو دو گیارہ تیرہ دو پندرہ ہو گئے۔

لاہور شہر میں داخل ہونے سے پیشتر حاتم طائی نے کمر ہمت خوب اچھی طرح سے کس لی تھی مگر دفتر روزگار کے باہر بیکار لوگوں کا جم غفیر دیکھ کر اس کی کمر ہمت کھل گئی۔ اب کے اس نے کمر ہمت کو پیٹی سے کس لیا۔ دفتر روزگار میں اپنا نام رجسٹر کروانے کے بعد حاتم طائی ایک پان فروش کی دوکان پر کھڑا اپنی بیڑی سلگا رہا تھا کہ اچانک اسے ندا آئی۔

ایک بار دیکھی دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔

اس نے دیکھا ایک طفل نادان رو رہا ہے اور پکار رہا ہے۔ حاتم نے جھک کر پوچھا۔

اے لڑکے! بتاؤ تمہیں کیا دیکھنا ہے؟

''فلم''

''کونسی فلم''

''لچھی''

اور حاتم طائی لچھی فلم کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ میکلوڈ روڈ کے چوراہے میں جو چہل پہل تھی اسے دیکھ کر حاتم طائی کی حیرت دنگ رہ گئی۔ ایک جگہ پیراڈائز ریستوران کے باہر درختوں تلے اسے چند نوجوان دائرے کی شکل میں آرام کرسیوں پر بیٹھے دکھائی دیئے۔ ان میں سے ایک کا رنگ سرخ تھا' لمبے لمبے بال سرخ اور گھنگریالے تھے۔ ٹھوڑی پر اگی ہوئی چھوٹی سی برش نما داڑھی کا رنگ بھی لال تھا۔ یہ نوجوان بے حد نحیف و کمزور تھا اور حاتم طائی کو اسے دیکھ کر مصر کے ابوالہول کا خیال آ گیا۔ اس نے ان لوگوں کے درمیان پہنچ کر ابوالہول سے پوچھا۔

اے مصر کے قدیم بت! کیا تم مجھے فلم لچھی کا ٹھکانہ بتلا سکتے ہو؟ کیوں کہ اس کی جدائی میں ایک لڑکا مینڈک بے آب کی طرح چلا رہا ہے۔

ابوالہول ہنسا' مسکرایا' اور بولا:

ہسٹری آف کیمونسٹ پارٹی میں تو اس کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ پھر وہ لڑکا اس کی خواہش کیوں کر رہا ہے۔ جاؤ اسے پارٹی لٹریچر پڑھنے کی ہدایت کرو۔

حاتم طائی نے جیب میں نقش سلیمانی نکال کر دیکھا کہ شام کے پونے نو بج رہے تھے اور ریڈیو پاکستان سے پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں خبریں سنانے کا اعلان ہو رہا تھا۔ قریب ہی بس سٹینڈ پر کھڑی ایک بڑھیا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر حاتم طائی سے فریاد

کی۔

"اے حاتم طائی! میں نے تیری سخاوت کے قصے سنے ہیں۔ خدارا میری مدد کرو۔ میرا بیٹا جیل میں ہے اور میں اس کے فراق میں گھلی جا رہی ہوں۔ خدا کے لیے اسے مجھ سے ملا اور منہ مانگی مراد پا"

حاتم طائی کی رگ حمیت پھڑک اٹھی۔ اس نے کہا۔

"اے بڑھیا! جیل خانہ کو راستہ کدھر سے جاتا ہے؟"

بڑھیا نے کہا۔

"اسی جگہ سے بس نمبر ۴ پکڑو۔ وہ تمہیں تین آنے میں جیل خانے پہنچا دے گی۔"

چنانچہ حاتم بس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ اور عورتیں سیاہ ریشمی برقعے اٹھائے آن کھڑی ہوئیں۔ حاتم نے ان کے حسن کی تاب لانے کی بہتیری کوشش کی مگر نہ لا سکا' اسے فوراً حسن بانو کا خیال آ گیا۔ اس خیال کے ساتھ ہی بس نمبر ۴ بھی آ گئی۔ حاتم لپک کر آگے بڑھا۔ کنڈیکٹر نے اسے پیچھے ہٹا دیا۔

"عورتیں پہلے"

اور حاتم طائی دبک کر ایک طرف ہو گیا۔ بس چلی تو کنڈیکٹر نے پوچھا۔

"کہاں جائیے گا؟"

"جیل خانے"

اس پر کچھ لوگ ہنس پڑے۔ تھوڑی دور چل کر بس رک گئی کنڈیکٹر بولا۔

"بھونڈ پورا اتریئے"

دو تین آدمی اتر گئے۔

بس ایک جگہ پھر رکی۔ کنڈیکٹر نے کہا۔

"پاگل خانہ"

یہاں کوئی نہ اترا بلکہ دو آدمی اوپر چڑھ آئے جنہوں نے آتے ہی زور سے قہقہہ لگایا اور پھر اطمینان سے سگریٹ کے کش لگانے لگے۔

بس پھر رکی۔

''گوروں کا قبرستان''

ہر مسافر کا چہرہ اتر گیا بلکہ کچھ لوگ تو بس سے بھی اتر گئے۔

جیل خانہ آیا۔ حاتم طائی بھی باہر نکل آیا۔ اب وہ سڑک پر تنہا تھا اور سامنے جیل کے آہنی دروازے کے باہر پہریدار بندوق اٹھائے چکر لگا رہا تھا۔ اس نے قیدی سے ملنے کے لیے پہریدار کی لاکھ منت کی مگر وہ مردنا ہنجار بالکل آمادہ نہ ہوا۔ ناچار حاتم طائی نے کمند لگا کر دیوار پھاندنے کا پروگرام بنایا۔ کمند بنانے کے لیے حاتم کو رسے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے ایک دوکاندار سے رسہ مانگا۔ دوکاندار نے کہا۔

''میاں یہاں رسہ کہاں''

''پھر میں کیا کروں؟'' حاتم نے دریافت کیا۔

دوکاندار بولا۔ ''تم کو چہ وان وتاں میں جاؤ۔ وہاں مضبوط رسے بنتے ہیں۔''

چنانچہ حاتم طائی کوچہ وان وتاں کی جانب چل پڑا اس غرض سے کہ شاید اسے کوئی رسہ مل جائے اور وہ جیل کی دیوار پھاند سکے۔ شہر میں پہنچتے ہی بھوک نے حاتم طائی پر اچانک حملہ کر دیا۔ حاتم نے بچنے کی بہتیری کوشش کی مگر حملہ چونکہ پیچھے کی طرف سے ہوا تھا اس لیے مجبوراً ہتھیار پھینکنے پڑے۔ حاتم ایک نانبائی کے ہاں پہنچا اور یوں گویا ہوا۔

اے نانبائی! میں بھوکا ہوں اور شہر میں نووارد ہوں۔ کیا تو مجھے کھانا کھلائے گا؟

نانبائی نے اپنے دھیان میں روٹی تندور میں لگاتے ہوئے کہا۔

معاف کرو بابا

حاتم طائی نے حیرانی سے پوچھا۔

مگر تمہارا قصور

نانبائی غصے میں بولا۔

بابا! یہ لنگر نہیں ہے۔ شام کے وقت تو چین لینے دو۔

حاتم بولا۔

مگراے نانبائی کے معزز بیٹے میں تو شام ہی کے وقت لنگرا لگایا کرتا تھا۔

نانبائی بولا۔

تم بے وقوف تھے۔ جاؤ اپنا راستہ ماپو۔

حاتم طائی نے مجبور ہو کر پیمانہ نکالا اور اپنا راستہ ماپنے لگا۔ ابھی اس نے چند گز ہی راستہ ماپا تھا کہ وہ ایک موٹر کی زد سے بمشکل بچا اور ناچار پیمانہ جیب میں ڈال کر میکلوڈ روڈ پر آن نکلا۔ رٹز سینما کے سامنے اسے ایک بوڑھا آدمی رو رو کر یہ کہتا سنائی دیا۔

''بلیک مارکیٹ کرا ور جیب میں ڈال''

حاتم نے پوچھا کہ بابا اس پہیلی کا مطلب کیا ہے؟ اس پر بوڑھا بولا کہ کسی ایم این اے سے مل کر کھڈیوں کا کارخانہ الاٹ کروا' سوت کا کوٹہ کنٹرول ریٹ پر خرید اور گھریلو ریٹ پر بیچ۔ کارخانہ چلا کر جو آمدنی ہوگی وہ اس بلیک کی آمدنی کے پاسنگ بھی نہ ہوگی۔ پس تو بھی یہی رٹ لگا کر بلیک مارکیٹ کرا ور جیب میں ڈال۔''

چلنا حاتم طائی کا بلیک مارکیٹ کی تلاش میں

لیکن بلیک مارکیٹ حاتم طائی کو کہیں نہ ملی۔ ہر آدمی نے اس کا پتہ بتانے سے لاعلمی ظاہر کی۔ گوالمنڈی کے چوک میں حاتم نے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ وہ ابھی ہجوم کی طرف بڑھا ہی تھا کہ بوڑھی عورت نے بڑھ کر اس کا دامن تھام لیا۔

''بیٹا! خدا تیرا راشن بڑھائے! میرا ایک سوال پورا کردے۔''

''ماں وہ سوال کونسا ہے؟''

تب بڑھیا یوں مخاطب ہوئی۔

بیٹا! مجھے مکان الاٹ کروادے۔

مگر ماں! مکان تو میرے پاس بھی نہیں۔

کیا تم پناہ گزین ہو؟

میں بغداد سے آیا ہوں

اپنا گھر بار لٹوا کر

نہیں ماں! میرا گھر بار میری بیوی حسن بانو کے پاس ہے جس کا ذکر تو نے قصہ حاتم طائی باتصویر میں ضرور پڑھا ہوگا۔''

تو بیٹا ایک مکان تو بھی الاٹ کرا لے"

حاتم طائی نے اتنا کہہ کر کمر ہمت باندھی اور مکان الاٹ کرانے چل پڑا۔ وہاں اس قدر رش تھا کہ حاتم کمر ہمت کو سنبھالتا ہی رہ گیا۔ اسی ہلڑ بازی میں کوئی شخص اس کا حاجیوں والا بسنتی رومال بھی لے اڑا۔ اب اسے بے حد بھوک لگ رہی تھی۔ ناچار ہو کر اس نے ایک باغ کے ویران کونے میں کھڑے ہو کر نقش سلیمانی نکالا اور اسے تین مرتبہ آنکھوں سے لگایا اور نعرہ مارا۔

"یا اللہ مدد!"

دفعتاً زمین پھٹ گئی۔ پہلے تو اس میں پانی نمودار ہوا اور پھر ایک دیو تیرتا باہر نکل آیا۔ دیو کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور وہ انگریزی اخبار نچوڑ رہا تھا۔ اس نے باہر نکلتے ہی برساتی اتاری اور عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"میرے آقا! کسی خشک جگہ بلایا ہوتا' اب کیا حکم ہے"

حاتم بولا۔

"کھانا چاہئے۔ کیا پکا ہے آج؟"

وہ بولا۔

"حضور پکا تو بہت کچھ ہے مگر آپ کا راشن کارڈ تو ابھی بنا ہی نہیں۔"

"مگر پہلے تو راشن کارڈ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی"

"حضور وہ دن گئے جب آپ فاختہ اڑایا کرتے تھے"

حاتم نے طیش میں آ کر کہا۔

"مگر ہم فاختہ اڑا کر دکھائیں گے"

جانا حاتم طائی کا فاختہ کی تلاش میں

اچانک ایک چوراہے میں اس نے ایک مرد بے حیا کو دیکھا کہ ہاتھ میں کاغذ کا ٹکڑا پکڑے قطار اندر قطار رو رہا ہے۔ حاتم طائی نے پوچھا۔

تجھے کیا دکھ ہے؟

مرد ناتواں بولا۔

پیارے حاتم! میں ایک مضمون نویس ہوں۔ افسوس ہے کہ میری شنوائی کہیں بھی نہیں۔ اس شہر میں اس وقت دو طبقے برسر اقتدار ہیں۔ اس میں سے ایک "حلقہ کباب شوق" ہے اور دوسرے کا نام "انجمن تلخی پسند شکنجبین" ہے۔ میری دال کہیں بھی نہیں گلتی۔ تو خدا کا نیک بندہ ہے۔ میرا مضمون لے جا اور شاید کہ پلنگ خفتہ باشد یعنی میری دال گل جائے۔

حاتم ان دونوں میں سے ایک طبقے کے ہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ شاعران و ادیبان و شتربانان قوم ایک جگہ جمع ہیں۔ کوئی سگریٹ پی رہا ہے۔ کوئی سگریٹ مانگ رہا ہے۔ جس کے پاس سگریٹ نہیں اور جو مانگ نہیں سکتا وہ لمبے لمبے سانس لے کر دھواں نگل رہا ہے اور نشے میں ہے۔ ہجوم اس قدر ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ حاتم نے جیب سے تل نکال کر دھرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ کارروائی شروع ہوئی۔

ایک شاعر نے اٹھ کر نحیف آواز میں نظم پڑھی۔ نظم کے الفاظ حاتم طائی کی سمجھ سے باہر تھے۔ حاتم نے جب بڑی دقتوں سے اسے سمجھا تو پتہ چلا کہ اس میں ملک کے ان پڑھ مزدوروں سے خطاب کیا گیا تھا۔ حاتم طائی نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے اور سر کے بل باہر نکل آیا۔ سڑک پر آ کر وہ پاؤں کے بل کھڑا ہوا اور قریبی کتب فروش کی دوکان پر کیا دیکھتا ہے کہ وہاں قصہ حاتم طائی باتصویر بک رہا ہے۔ اس کتاب میں حاتم نے کاتب و آرٹسٹ کے ہاتھ سے بنی ہوئی اپنی تصویر ملاحظہ فرمائی اور زار زار آنسو رونے لگا۔ کیونکہ اس کی تصویر اس سے کہیں زیادہ اچھی تھی۔ دوکاندار نے حاتم کو رومال دیتے ہوئے کہا۔

"مت رو حاتم! تو نے لاہور میں بہت سی نیکیاں جمع کر لی ہیں۔ لہٰذا تو اسے دریا برد کرنے کیوں نہیں جاتا۔"

جانا بطرف دریا حاتم کا ڈبونے نیکیوں کو

ابھی حاتم طائی دریائے راوی پر پہنچ کر نیکیوں کو دریا میں ڈبونے کے لیے ان کے کپڑے اتار رہا تھا کہ ایک مچھلی اچھل کر باہر آ گئی اور مگرمچھ کے آنسو روتے ہوئے بولی۔

"حاتم پیارے! میں ایک مدت سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔ اب خدا کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے چل اور شہر کی سیر کروا۔ میں سینما بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے بتاؤ آج اوڈین سینما میں عورتوں کا کوئی شو ہے؟ ہائے مجھے دل لگی کے گانے بے حد پسند ہیں۔ لوگ کشتی میں بیٹھ کر اکثر گنگنایا کرتے ہیں اور میں گھر میں بیٹھی سنا کرتی ہوں۔ میری ماں کہتی ہے کہ شادی سے پہلے میں فلم نہیں دیکھ سکتی۔ خدا کے لیے مجھے ایک بار دل لگی دکھلانے لے چل۔"

حاتم نے راستے میں وہ طوطے خریدے تھے۔ جنہیں اس نے ہاتھوں پر بٹھلا رکھا تھا۔ مچھلی کا بیان سن کر وہ دونوں طوطے اڑ گئے

اور وہ طوطوں کے غم میں واپس لوٹ آیا۔

اب رات آ گئی تھی اور حاتم طائی کو شب باشی کا فکر دامن گیر ہوا۔ پہلے وہ خانہ خدا میں پہنچا۔ جہاں خدا کا خلیفہ اس سے بڑے تپاک سے ملا۔ مولوی صاحب نے بعدازاں پوچھا۔

''حضرت صاحب! رات کہاں بسر کرنے کا ارادہ ہے؟''

حاتم طائی بولا۔

حضور! خدا کے در پر ہی پڑے رہنے کا خیال ہے۔

خلیفہ خدا چکرا گئے۔

میاں صاحب! خانہ خدا میں چوریاں بہت ہوتی ہیں۔ بہتر ہو اگر آپ کسی سرائے میں ٹک جائیں۔

حاتم طائی جب مسجد سے باہر نکلا تو اسے معلوم ہوا کہ مسجد میں چوری کا وقت ہو چکا تھا اور اس کا جوتا غائب تھا۔ مجبوراً حاتم نے پاؤں سر پر رکھے اور وہاں سے بطرف سرائے چل پڑا۔ حاتم طائی موچی دروازے کی تنگ و تاریک گلیوں سے گزر رہا تھا کہ ایک جگہ سے اس نے اپنے پیچھے کسی آدمی کے بھاگنے کی آواز سنی۔ وہ مڑا تو ایک آدمی تیزی سے گزر گیا۔ اس آدمی نے صرف لنگوٹی پہن رکھی تھی۔ حاتم طائی نے سنا کہ لوگ عقب میں چور چور پکار رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے لپک کر چور کو پکڑنا چاہا مگر ہاتھ صرف لنگوٹی پر پڑا اور لنگوٹی کھل گئی۔ لوگوں نے حاتم کو گھیر کر پوچھا۔

چور کہاں ہے

حاتم بولا۔

چلو یہی سہی

اور لنگوٹی حاتم سے چھین لی گئی۔

سرائے میں رات گزارنے سے پہلے حاتم طائی کے کپڑے اتروا کر مالک سرائے نے احتیاطاً رکھوا لیے۔ رات بھر حاتم طائی کو کھٹمل تنگ کرتے رہے۔ وہ حسن بانو کی یاد میں ٹھنڈی میٹھی آہیں بھرتا رہا اور ساتھ والی کوٹھڑی میں ایک سیٹھ چین کی بنسی بجاتا رہا۔ حاتم طائی کو چین کی بنسی کی اکھڑی اکھڑی آواز نے بالکل نہ سونے دیا۔

صبح ہوئی اور پنچھی جاگے اور جب چوک چکلن کو بھاگے تو حاتم بھی بیدار ہوا۔ اس نے ایک معشوقانہ انگڑائی لی مگر عین عالم انگڑائی

میں سرائے کے موٹے مالک کی نظر پڑ گئی اور حاتم نے شرما کر ہاتھ چھوڑ دیے۔ سرائے کا مالک آنکھیں مٹکا کر گانے لگا۔

انگڑائی تیری ہے بہانہ

صاف کہہ دو کہ جانا جانا

حاتم طائی نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں جانا چاہتا ہوں اس نے اپنے کپڑے طلب کیے تو سرائے کا مالک صاف مکر گیا۔ حاتم نے فلک شگاف نعرہ لگایا اور ننگے پاؤں، ننگے سر، ننگے بدن، ریل گھر کی طرف چل پڑا۔ راہ میں اس نے اخبار خریدا اور اسے باندھ لیا۔ ایک جگہ اسے سڑک کے کنارے تار کا ٹکڑا دکھائی دیا۔ اس نے اسے فوراً اٹھا لیا اور ریل گھر کے تار گھر کے بابو کو دے کر کہا۔

"یہ تار در شہر بغداد پاس حسن بانو ولد عشق دین کو شرف باد پہنچا دو اور تاکید کر دو کہ تیرا حاتم عنقریب تیرے پاس پہنچ رہا ہے اور تو شربت وصل تیار رکھ اور شربت میں برف زیادہ ہو۔"

جانا حاتم طائی کا شہر لاہور سے اور ختم ہونا ہمارے قصے کا

◆◆◆

صحرا صحرا

تمہیں دیر سے خط لکھ رہی ہوں۔

مجھے معاف کر دینا۔ پچھلے دنوں سے میری حالت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر مجھ سے بہت سی باتیں چھپا رہے ہیں۔ مگر میں جانتی ہوں میرے پھیپھڑے تقریباً چھلنی ہو چکے ہیں اور شاید تمہارا خط آنے تک میں اس دنیا میں نہ رہ سکوں۔

زندگی کا جہاز وقت کے سمندر میں اپنی مسافت ختم کر چکا ہے اور میں نڈھال پژمردہ جسم لیے عرشے پر کھڑی افسردہ نگاہوں سے موت کے ساحل کو لحہ بہ لحہ قریب آتے دیکھ رہی ہوں۔ یہ ساحل دھندلا اور کہر آلود ہے۔ زندگی کی پر ہجوم شاہراہوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر ایک خاموش، پرسکوں اور اجنبی سرزمین میں داخل ہو رہی ہوں۔ اس سرزمین سے ہو کر جانے والی ویران راہگزار مجھے کس منزل کا سراغ دے گی؟ وہاں کیسے لوگ ہوں گے؟ کیا میں اپنے ان مہربانوں سے دوبارہ مل سکوں گی جو زندگی کے بھرے میلے میں میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے؟ کچھ نہیں جانتی۔

کلثوم! میں یہاں بالکل اکیلی ہوں۔

یہ کمرہ وکٹوریہ ہسپتال کی دوسری منزل پر ہے۔ یہ اونچی چھت، لمبی کھڑکیوں اور آدھی سپید آدھی سیاہ دیواروں والا سرد اور خاموش کمرہ۔ جس کا فرش تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چونے سے صاف ہوتا رہتا ہے۔ مجھے اس کمرے کی برف آلود تنہائی سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔ میں اس وقت تمہیں یاد کر رہی ہوں۔ کاش تم میرے قریب۔ میرے سامنے بیٹھی ہوتیں۔ تمہارا چمکیلی آنکھوں والا شگفتہ چہرہ میرے مقابل ہوتا اور تمہارے کپڑوں میں سے اٹھتی ہوئی شیریں مگر مدھم مہک کمرے میں پھیل جاتی۔ تم بول رہی ہوتیں اور مجھے اپنا آپ تمہاری آواز کی نرم و سبک رفتار لہروں پر ڈولتا محسوس ہوتا۔ کاش ایسا ہو سکتا...... کاش!

مگر تم مجھ سے کوسوں دور ایک پرسکوں قصبے کی سادہ اور کھلی فضا میں سانس لے رہی ہو۔ تمہاری زندگی ایک پر بہار چمکیلا دن ہے جسے تم کسی شاداب ندی کے سایہ دار کنارے پر آزادی سے چہل قدمی میں گزار دو۔ تمہارا محبت کرنے والا خاوند تمہارے ساتھ ہو اور تمہارے معصوم بچے تتلیوں کا پیچھا کر رہے ہوں۔ خدا کرے کہ تمہاری اس مہکتی ہوئی روشن زندگی پر شام کے ماتمی سائے کبھی نہ جھکیں

اورتم اپنے پیاروں کی سنگت میں سدا سکھی رہو۔ میں تو ایک اجڑی ہوئی کارواں سرائے ہوں جو کبھی آباد تھی۔ جہاں دور دور سے آئے ہوئے قافلے پڑاؤ ڈال کر رات کو الاؤ کی روشنی میں پر اسرار داستانیں چھیڑ دیا کرتے تھے۔ لیکن اب یہاں کوئی نہیں آتا۔ راستوں پر گھاس اگ آئی ہے اور بام و در ہمہ تن انتظار بنے ان وادیوں کو تک رہے ہیں جو کبھی اہل کارواں کے ترانوں سے گونجا کرتی تھیں۔

زندگی نے مجھ سے منہ موڑ لیا ہے کلثوم!

تمہیں یاد ہے کبھی میرے بال کس قدر لمبے تھے! سونے کے تاروں جیسے سنہری اور چمکدار۔ اسکول میں ہر لڑکی ان کی گرویدہ تھی۔ مگر آج ان کی چمک بجھ گئی ہے اور ان کا رنگ راکھ ایسا ہو رہا ہے۔ نرس کنگھی کر کے ہر بار جھڑے ہوئے مردہ بالوں کا گچھا باہر پھینکتی ہے۔ وہ مجھ سے آنکھ بچا کر ایسا کرتی ہے اسے خیال ہے کہیں میں زیادہ غمگین نہ ہو جاؤں۔ بھلا ایسی باتوں سے کیا ہوتا ہے!

میرا کمرہ خاموش ہے اور میں چپ چاپ' اپنے آہنی پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائے' گھٹنوں تک سرخ کمبل اوڑھے تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ میرے سامنے والی کھڑکی کھلی ہے۔ باہر درختوں کی ٹہنیاں نرم ہوا میں آہستہ آہستہ ڈول رہی ہیں۔ تیسرے پہر کی چمکیلی دھوپ میں ہلکا سنہری پن سا گھل گیا ہے اور آسمان کا رنگ گہرا نیلا ہو گیا ہے۔ کمرے کی فضا میں مختلف قسم کی دوائیوں کی بو رچی ہوئی ہے۔ پہلے روز جب میں اس کمرے میں آئی تھی تو مجھے یہ بو بے حد ناگوار معلوم ہوئی تھی لیکن آج یہ میرے پھیپھڑوں کا ایک جزو بن گئی ہے۔ میرے قریب ہی چھوٹی سی میز پر گل دان میں گلاب کے دو تین پھول پڑے ہیں۔ ان کی مخملیں پتیوں کا رنگ اڑ سا گیا ہے۔ جیسے ان کے بھی پھیپھڑے خراب ہو گئے ہوں۔ یہ پھول میرا خاوند چھوڑ گیا ہے۔ جوں جوں میں زیادہ بیمار اور ناتواں ہو رہی ہوں وہ زیادہ رومانٹک ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے پیشتر وہ میرے پاس گھنٹوں بیٹھا انتہائی روکھی پھیکی باتیں کیا کرتا تھا۔ مثلاً حکومت اپنی طرف سے چمڑا رنگنے کے کارخانے قائم کر رہی ہے۔ ڈاک گھر سے کچہری جانے والی سڑک پر لک پھیری جا رہی ہے' ہینگ کی چھیاسٹھ بوریاں ریلوے مال گودام میں پہنچ گئی ہیں' کل چھکڑوں کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا اور اس سال فصل کو اولوں نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ کیوں' تمہارا کیا خیال ہے کلثوم؟

اور میں لمبی سی "ہوں!" کہہ کر تھکی تھکی پلکیں بند کر لیتی۔ اب میں اس سے کیسے کہتی کہ اس کی یہ باتیں جن سے وہ میرا جی بہلانے کی کوشش کرتا ہے میری تنہائی کو زیادہ ہولناک بنا دیتی ہیں اور مجھے چمڑے رنگنے کے کارخانے اور ہینگ کی بوریوں سے کوئی سروکار نہیں اور اگر میں زیادہ جرات سے کام لوں تو میرا اس ادھیڑ عمر بیوپاری خاوند سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس نے میرا جسم خریدا تھا' کھال خریدی تھی نرم اور گداز کھال۔ دل نہیں۔

کلثوم! تم میری اس وقت کی حالت کا اندازہ لگانے سے قاصر ہو جب اس کے پھولے ہوئے نتھنوں کا تعفن میرے دماغ میں گھسنے لگتا ہے۔ تم میرے لوچدار جسم کے دائروں اور خموں سے مسحور ہو کر کبھی کبھی بے اختیار مجھ سے لپٹ جایا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں ہائے وہ تمہارے بول میں کیسے بھلا دوں؟

''مریم! تم وینس ہو۔ تمہیں عجائب گھر میں رکھنا چاہئے تاکہ غیر ملکی سیاح اور سنگتراش اپنے روزنامچوں میں تمہارا ذکر کریں۔''

مستقبل کا درخشاں خواب جس کے رنگ ہم نے افق پر پھیلی ہوئی قوس قزح سے مستعار لیے تھے آنسو بن کر میری پلکوں پر ڈھلک آئے ہیں اور میں اپنے تئیں کڑوے دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں پا رہی ہوں۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ مجھ پر کھانسی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ میں دن میں کئی بار خون تھوکتی ہوں اور خاوند دن بدن رومانٹک ہوتا جا رہا ہے۔ شاید ہسپتال کے ڈاکٹروں نے اسے ایسا مشورہ دیا ہے۔ اب وہ بلا ناغہ میرے لیے کبھی گلاب، کبھی یاسمین اور کبھی نرگس کے پھول لاتا ہے۔ لیکن جتنی دیر وہ میرے پاس کمرے میں رہتا ہے ہینگ کی تیز بو مجھے بے حال رکھتی ہے۔ کسی وقت وہ پھول میرے منہ کے پاس لے جا کر کہتا ہے۔

''کتنی پیاری خوشبو آ رہی ہے''

اور ہینگ کی بدبو سے میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ میں اپنا سانس روک لیتی ہوں۔

''ہاں بڑی اچھی خوشبو ہے''

کلثوم! اسے مجھ سے بڑی محبت ہے۔ وہ اگرچہ ادھیڑ عمر، بھدا اور بدصورت ہے مگر اس کا دل کسی معصوم بچے کے دل سے بھی زیادہ بے داغ اور بے لوث ہے۔ کبھی کبھی اس پر بڑا ترس آتا ہے اور میرا دل بے اختیار اس سے چمٹ کر رونے کو چاہتا ہے۔ وہ میری محبت کا بھوکا ہے اور یہی وہ شے ہے جو میں خواہش کے باوجود اسے دینے سے معذور ہوں۔ اس لیے کہ میرا اپنا دامن بھی خالی ہے۔ کاش وہ میرا ہم عمر ہی ہوتا۔ پھر شاید اس کے گرم خون کی حدت میرے برف آلود جذبات کو گھڑی بھر کے لیے پگھلا دیتی اور میں اس لاوے کی رو سے بہہ کر اس کی محبت کا ہمیشہ کے لیے دم بھر لیتی۔ مگر جیسا کہ تم جانتی ہو وہ بدنصیب مجھ سے بیس سال بڑا ہے اور اس کی پھولی ہوئی توند سے تنگ میں اکثر کانپ سی گئی ہوں، جیسے میں اپنے باپ...

ہائے میں اس کی خالی جھولی موتیوں سے کیسے بھروں؟ اس کی ان جانی آواز کو اپنے دل کی دھڑکنیں کیسے بناؤں؟ وہ مجھے دکھائی دیتے ہوئے بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ قریب ہوتے ہوئے بھی مجھ سے کوسوں دور ہے۔ کاش میں اسے چاہ سکتی، اسی شدت اور اسی خلوص سے، جس طرح میں نے انور کو چاہا تھا۔

انور! میرا انور!

ذرا ٹھہرو... یہ آواز کیسی تھی؟

بڑی ویران' بڑی دردانگیز... جیسے کوئی بدنصیب نقاہت سے بوجھل قدم اٹھائے خزاں نصیب پتوں پر چل رہا ہو۔ انور؟ انور

... کیا یہ تم تھے؟

نہیں وہ تو نہیں... کمرہ خالی ہے' بالکل خالی' یہاں میرے سوا اور کوئی بھی نہیں۔ پھر مجھے یوں محسوس کیوں ہو رہا ہے گویا کوئی میرے پیچھے کھڑا اکھڑی اکھڑی دردمند نگاہوں سے مجھے تک رہا ہو۔ میں اپنی گردن پر نیم گرم کرنوں کا جال سا محسوس کر رہی ہوں۔

میری اچھی کلثوم! تمہارے لیے انور ایک بالکل اجنبی سا نام ہے۔ آج سے پیشتر تم نے یہ نام میری زبان پر شاید ہی کبھی سنا ہو۔ یہ نام میری زندگی کے ایک المناک باب کا عنوان ہے۔ اس باب کو میں نے تمہارے سامنے کبھی نہیں کھولا۔ لیکن آج جبکہ میں زندگی کی تاریک سرحد پر کھڑی ہوں اور موت نے لحہ بہ لحہ گہرے ہوتے کہرے کی مانند مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے میں اس کہانی کو تمہارے سامنے شروع سے آخر تک پڑھ دینا چاہتی ہوں۔ ہوسکتا ہے اس داستان میں تمہیں آسمانی دھنک کے شوخ رنگ دکھائی نہ دیں اور تمہارے لیے یہ بات اتنی ہی غیر اہم ہو جیسے ایک ستارہ نور کی لکیر کھینچتا ہوا ٹوٹ جائے اور اس کے اجزا جل بجھ کر کہیں خلا میں تحلیل ہو جائیں۔ مگر میں اس غیر اہم حادثے کو ایک مدت سے اپنے دل کی گہرائیوں میں دفن کیے ہوئے ہوں' اتنی اتھاہ گہرائیوں میں کہ اس کا خیال تو کبھی خواب کا روپ دھار کر بھی میرے ذہن کی سطح پر نہیں ابھر سکا۔

اس مدفن' اس تربت میں میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ محو خواب ہے۔ میرے قریب آ جاؤ کلثوم! اور قریب' کفن سرکانے سے پہلے میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ سے زیادہ نزدیک آ جاؤ۔

یہ ہے وہ لاش!

یہ ہے وہ المیہ!

انور! بدنصیب انور!

جو شام پڑے کسی گم کردہ راہ مسافر کی طرح اس سرائے میں آیا اور دن نکلنے سے پیشتر ہی نور و ظلمت کے غیر مرئی دھندلکوں میں کہیں گم ہو گیا۔ ٹھیک گیارہ برس گزرے اس پردیسی نے ہسپتال میں چھ ماہ بیمار رہ کر دم توڑا تھا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ اب اس دنیا میں کبھی نہیں آئے گا۔ اس ریل گاڑی کی مانند جو لائن ٹوٹ جانے کے باعث اپنا اصلی راستہ چھوڑ کر کچھ عرصہ کسی معمولی

اسٹیشن کا چکر کاٹ کر گزرتی رہے مگر لائن درست ہو جانے پر اپنی اصلی شاہراہ پر لوٹ آئے اور اس عارضی اسٹیشن کو بالکل بھول جائے۔ وہ اچانک ہمارے گھر نمودار ہوا اور کچھ عرصہ رہنے کے بعد چپ چاپ کہیں غائب ہو گیا۔ میں صرف اتنا جان سکی ہوں کہ اس کا نام انور تھا اور مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ میرے لیے سب کچھ تھا....... سب کچھ۔

اسے پہلی بار مکان کے نچلے کمرے میں بیٹھا دیکھ کر مجھے دفعتاً یوں معلوم ہوا تھا گویا میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہو۔ کہاں دیکھا تھا؟ کب دیکھا تھا؟ یاد نہیں آ رہا تھا۔ ایک خیال' ایک واہمہ۔ ایک بھٹکا ہوا جگنو سا تھا جو ماضی کے مہیب اندھیروں میں کبھی یہاں کبھی وہاں چمک رہا تھا۔ وہ میرے بھائی جان کے پاس کرسی پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا اور میں چق کے ساتھ لگی ہوئی اس کے خاموش اور دبلے پتلے چہرے کو تک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر دھیمی دھیمی ملول سی چمک تھی جیسے کتاب کے اوراق روشن ہوں۔ جانے کتنی دیر میں چق کے ساتھ لگی کھڑی رہی کہ باورچی خانے سے دودھ جلنے کی بو آئی اور مجھے وہاں سے ہٹنا پڑا۔ جب دوبارہ وہاں پہنچی تو کمرہ خالی تھا۔

انور اکثر ہمارے گھر آنے لگا۔ لیکن وہ صرف نچلے کمرے میں بیٹھا کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا۔ جیسے وہ کتابوں کی مدد سے گمشدہ خزانے کا سراغ لگانا چاہتا ہو۔ جب وہ کتاب پڑھ چکتا تو اسے آہستہ سے میز پر لٹکا دیتا۔ پرسکون انداز میں سگریٹ سلگاتا اور بڑے ہی نرم اور دھیمے لہجے میں بھائی جان سے باتیں شروع کر دیتا۔ میں چق کے ساتھ لگی ہمہ تن گوش ہو جاتی۔ انور کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے ہلکے پھلکے لفظ ننھی منی پریوں کے بھیس میں مجھے اپنے سامنے سے رقص کرتے ہوئے گزرتے ہوئے معلوم ہوتے اور میرا جی چاہتا کہ انہیں بے اختیار اپنے گلے سے لگا لوں۔

ایک سال گزر گیا۔ میں انور کے متعلق صرف اتنا جان سکی کہ وہ بھائی جان کا دوست ہے اور کسی دوسرے شہر سے وہاں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا ہے۔ پورے ایک سال تک میری محبت کی ڈوبتی کشتی گمنامی کے عمیق سمندروں تلے چکر لگاتی رہی اور جب وہ سطح آب پر ابھری تو انور وکٹوریہ ہسپتال کی دوسری منزل میں چھ ماہ سے بیمار پڑا تھا۔ مجھے پتہ چلا اس کی حالت دن بدن گر رہی ہے اور اس بھری دنیا میں اس کا سوائے بھائی جان کے اور کوئی پرسان حال نہیں۔ میرے کلیجے میں تیر سا لگا اور میں اپنے آپ کو وہاں جانے سے نہ روک سکی۔ کچھ دنوں کے لیے میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں چلی گئی اور پھر وہاں سے ایک شام چپکے سے ہسپتال جا پہنچی۔

کمرے میں چھت سے لٹکی ہوئی زرد بتی جل رہی تھی جس کی بیمار روشنی کے پھیکے غبار میں انور پلنگ پر آنکھیں بند کیے چت لیٹا تھا۔ سرخ کمبل اس کے سینے تک تھا۔ اداس فضا میں اس کے سانس کی آواز پر سرد آہوں کا گمان ہو رہا تھا۔ میں اپنا آپ سنبھالے' سنبھل

سنبھل کر قدم اٹھاتی پلنگ کے پاس گئی اور اپنے پردیسی محبوب پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ وہ سو رہا تھا اور اس کی کھلی پیشانی پر نمی کی ہلکی سی تہہ چمک رہی تھی۔ وہ بے حد کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ دائرے سے نمودار ہو چکے تھے اور خشک ہونٹ اندر کو بھنچے ہوئے تھے۔ میں بت بنی زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی اولین اور آخری محبت کے کھنڈر کو دیکھ رہی تھی۔ میرا دل بوجھل ہو رہا تھا اور میں بمشکل کھڑی تھی۔ میں پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ معاً انور کے لب ہلے۔ میں ہمہ تن گوش ہو گئی۔ وہ کسی کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ میں نے سانس روک لیا۔ اس کی آواز لاغر اور بے حد نحیف تھی۔ میں اس پر جھک گئی اور پھر میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور پیاسے کانوں سے انور کے ہونٹوں تک آیا ہوا ایک نام سنا... جو میرا نہیں تھا... میرے دل پر جیسے کسی نے برف کی سل رکھ دی۔ میں نے اپنا بھاری سر کرسی کی پشت سے لگا دیا اور میری آنکھیں آپ سے آپ بھر آئیں۔ جانے کتنی دیر تک میری آنکھیں روتی رہیں اور روتے روتے خشک ہو گئیں اور پھر جیسے خواب... بالکل خواب کے عالم میں مجھے انور کی کمزور آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی۔ جیسے وہ مجھے میرے نام سے بلا رہا ہو۔ میں جلدی سے اٹھی اور دیکھا کہ وہ مر چکا تھا۔ اس کا ناتواں چہرہ پہلے سے زیادہ پرسکون تھا اور آنکھیں تاریک حلقوں میں ڈوب سی گئی تھیں۔ میں نے دل پر ہاتھ رکھا۔

وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

انور اب اس دنیا میں نہیں ہے وہ اس دنیا میں کبھی نہ آئے گا اور میں اس بھید کو کبھی نہ پا سکوں گی کہ مرنے سے پہلے اس نے مجھ بدنصیب کو پکارا تھا یا وہ محض ایک خواب تھا' وہم تھا... وہ آواز وہ پکار' جو شاید میرے ہی نام کا سہارا لے کر انور کے ہونٹوں سے پہلی اور آخری مرتبہ بلند ہوئی تھی میرے دل کے ویران سنگھاسن پر سو گئی ہے۔ جب میں مر جاؤں گی اور قبر میں پڑی ہوں گی تو وہ آواز وہ پکار ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو گی اور میرے کان میں آ کر والہانہ سرگوشوں میں بتائے گی کہ زندگی دکھ درد اور مصائب کے باوجود کس قدر انمول اور سہانی تھی۔

کلثوم! اس بات کو اب بارھواں سال بیت رہا ہے اور میں زندگی اور موت کے تاریک سنگم پر کھڑی ہوں۔ زندگی کے مرغزار ختم ہو رہے ہیں' موت کا سنگلاخ سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں' کاش اس وقت تم میرے پاس ہوتیں اور میں ان خالی ہاتھوں کو تمہاری سمت پھیلا کر تمہیں اپنی آغوش میں بھینچ لیتی اور تمہارے سینے سے لگ کر جی بھر کر روتی اور آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان تمہیں بتاتی کہ تمہاری سہیلی کے دل پر لگے ہوئے گھاؤ کتنے گہرے ہیں... کاش ایسا ہو سکتا... کاش!

کئی بار جب میں اپنے خاوند کے جسم سے قریب ہوتی تو آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے۔ اس وقت وہ انجان کسی بچے کی

طرح حیران ہو کر پوچھنے لگتا۔

''کیا گھر یاد آ رہا ہے مریم؟''

''مریم میری کوئی بات بری لگی؟''

ہائے مجھے کسی کی بات کیوں بری لگنے لگی؟ کیا اس دنیا میں ایک بھی آدمی ایسا پیدا نہیں ہوا جس کا ہاتھ ہمارے دلوں کی گہرائیوں تک پہنچ سکے؟ آخر مرد ہمیں کیوں اس طرح سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح بھونرے پھولوں کو؟

اب شام ہو رہی ہے۔ باہر درختوں پر شفق کا زریں عکس ماند پڑنے لگا ہے اور کھلی کھڑکی میں سے شام کے خنک سائے دبے دبے اندر آ رہے ہیں۔ کمرے میں سردی بڑھ رہی ہے۔ میز پر گلاب کے افسردہ پھول شام کے استقبال میں سرنگوں ہو گئے ہیں۔ نرس کے دوائی لانے کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ آ رہی ہو گی۔ کلثوم! زندگی لمبی بھی ہے اور مختصر بھی' اس میں اچھائی بھی ہے اور برائی بھی' لیکن وقت برق رفتاری سے گزر رہا ہے اور ہر شے خوب سے خوب تر ماحول کی جستجو میں مصروف پیکار ہے۔ لوگ بہت آگے نکل گئے ہیں اور ہم ہسپتالوں کے ٹھنڈے کمروں میں' سرنگوں پھولوں اور سرد آتشدانوں کے درمیان لیٹے موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے ہر پل' ہر گھڑی ہر لحظہ کچھ اس قسم کا احساس ہو رہا ہے جیسے کوئی شخص میرے بالکل قریب... شاید میرے ہی پلنگ پر دم توڑ رہا ہے۔

انور؟... انور... کیا یہ تم ہو؟

آہ شاید میں پاگل ہو رہی ہوں۔ میں اپنے حواس کھو بیٹھی ہوں۔ میں تو توہم پرست نہیں ہوں۔ مگر بدقسمت ضرور ہوں۔ زندگی میں ایک بار... صرف ایک بار میرے گھر کے آنگن میں بھی بہار آئی تھی۔ میرے دروازے پر بھی خوشیوں کے ہجوم نے کبھی دستک دی تھی' لیکن میں اپنے بستر سے اٹھ کر اس کا استقبال نہ کر سکی۔ اب میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ زندگی کی ریل میرے سٹیشن سے چلنے ہی والی ہے۔ سگنل گر چکا ہے اب صرف جھنڈی لہرائے جانے کی دیر ہے اور میرا اسٹیشن ویران ہو جائے گا۔

ہر شے ختم ہو چکی ہے۔ میں زمین کے اسٹیج پر جھک کر دنیا والوں سے اچھے اور برے لوگوں سے آخری بار رخصت طلب کر رہی ہوں۔ مجھے اس رخصتی کا بالکل افسوس نہیں۔ میں خشک پتوں کا ڈھیر ضرور ہوں مگر ان ہی پتوں پر آنے والی بہار کا پیام بھی پڑھ رہی ہوں۔ ان کی سوکھی رگوں میں کسی امید کی لطیف دھڑکنیں بھی سن رہی ہوں۔ امید... آنے والی ابدی بہار کی امید!

جب برہنہ درختوں کی سیاہ ٹہنیوں پر قدرت اپنا زرتار آنچل پھیلا دے گی اور زمین کی مردہ رگوں میں نئی زندگی کا سیال جادو بہار بن کر اس افق سے اس افق تک پھیل جائے گا اور پھر کوئی انور محبت کا ڈنک کھا کر پردیس میں بے یار و مددگار دم نہیں توڑے گا اور کوئی

مریم ہسپتال میں بیٹھ کر خون تھوکتے ہوئے کسی کلثوم کو ماتمی خطوط نہیں لکھے گی اور کسی کو چینگ کی بوریوں سے لدے ہوئے چھکڑے لے کران مرغزاروں اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی جھیلوں کا رخ نہیں کرنے دیا جائے گا جہاں رات کے نورانی غبار میں پریاں نہانے کے لیے اترا کرتی ہیں۔ یہی ایک کرن باقی ہے... امید کی آخری کرن!

وہ دن ضرور آئے گا۔ وہ دن بہت جلد آ رہا ہے۔ میں گھنٹیوں کی آوازیں سن رہی ہوں۔ میں بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سن رہی ہوں۔ مر جاؤں گی لیکن میری روح دنیا کے ہر ملک' ہر شہر ہر بازار میں اس درخشاں دور کی راہ دیکھے گی... ہماری زندگی مختصر سہی مگر اس دور کی زندگی مختصر نہ ہوگی جو ہمیں آزادی و مسرت کے ان دیکھے جزیروں سے روشناس کرائے گا۔ میں نہ ہوں گی مگر میرے بچے' تمہارے بچے ان جزیروں کی تلاش میں مہموں کی شکل میں روانہ ہوں گے اور طوفانی سمندروں سے الجھتے رہیں گے۔

کلثوم! وقت آ رہا ہے جب نئی مسرتیں تم سے نئے خون اور نئی زندگی کا مطالبہ کریں گی۔ کم از کم اس وقت تک بوڑھی مت ہونا اور اگر تم ایسا نہ کرسکو تو اس نئے خون اور نئی زندگی کی امانت کو اپنے بچوں کے سپرد کر جانا۔ اپنے بچوں کے منہ اوپر اٹھاؤ مشرقی افق پر سحر کا نور مسکرا رہا ہے...

اور نرس شام کی دوائی لا رہی ہے۔ اس کے سینڈل کی ٹک ٹک میرے کمرے کی طرف بڑھ رہی ہے... زندہ رہو اور پر امید!

◆◆◆

واپسی

''تمام بڑے شہر ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں''

یہ میرا مقولہ ہے اور اگر آپ ذرا غور کریں تو آپ کا بھی ہو سکتا ہے۔ جس طرح زیادہ دیر ایک جگہ اکٹھا رہنے سے ہمیں ایک دوسرے کی صورت میں اپنے خدوخال کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے۔ اسی طرح ہر بڑے شہر کا باشندہ اپنے شہر کی تصویر ہوتا ہے۔ آپ لاہور ہی کو لیں۔ اس شہر میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں جن سے باتیں کرتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ موچی دروازے کے باہر کھڑے گنے کا رس پی رہے ہیں اور ایسے آدمی بھی ملیں گے جن کی گفتگو ایسا سماں باندھے گی گویا آپ چڑیا گھر کی سیر کر رہے ہیں۔ لاہور کی سڑکوں' گلی کوچوں اور مکانوں کی طرح یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے گھٹے ہوئے ذہنوں میں مکڑیوں نے جالے بن رکھے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جن کے دل دھوپ میں چمکتی ہوئی ندی ایسا منظر پیش کرتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو کارپوریشن کے چھکڑے کی مانند ہر راہ گیر کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور ایسے حضرات بھی ہیں جو ایک نمبر بس کی طرح چپکے سے آپ کے پاس آن کھڑے ہوں گے یہاں کاہل بھی ہیں' غافل بھی ہیں' ہوشیار بھی ہیں۔ جو شور مچاتے ہیں' گرد اڑاتے ہیں' کیچڑ اچھالتے ہیں۔ گرد' کیچڑ' شور بدبو یہ ہے شہر کی سوغات!

اور دیہات؟ حسن' سادگی' خلوص' سکون خامشی' موت یہی وہ پگ ڈنڈی ہے جہاں سے گزر کر ہم مال روڈ تک آ گئے ہیں اور اب ہمارے کپڑوں میں پودینے کے کھیتوں کی مہک نہیں بلکہ تارکول کی بدبو ہے۔ ہم خالص دودھ پی کر روانہ ہوئے تھے۔ اس دودھ میں مکھن گھلا ہوا تھا اور وہ شہر کے دودھ سے زیادہ میٹھا تھا لیکن اس کا خلوص تارکول کی بدبو کا متحمل نہیں ہو سکا۔ وہ پھٹ گیا ہے' اس کا رنگ' ذائقہ' تاثیر ہر شے بدل گئی ہے۔ مگر دیہات میں دودھ کی کمی نہیں۔ کھلے کھیت' کھلی ہوا' کھلے دل' ہوا کو چلنے دو۔ کھیت لہلہانے دو۔ محبت کھیتوں میں اگتی ہے اور نفرت پتھروں سے چھوٹتی ہے۔ اور شہروں میں پتھروں کے ڈھیر ہیں' نفرت کے مینار ہیں۔ یہاں ایک بھی کھیت نہیں۔ چلو گاؤں چلیں!

چنانچہ ایک روز دیہاتی محبت نے اس قدر جوش مارا کہ میں ''ماہی والا'' گاؤں کی طرف چل پڑا۔ اس گاؤں میں مکھن نامی گوجر

سے میری واقفیت تھی۔ وہ ہمارے محلے کی سب سے بڑی دوکان پر دودھ لاتا تھا اور مجھے کئی بار گاؤں آنے کی دعوت دے چکا تھا۔ اومنی بس نے آخری پڑاؤ پر مجھے اتار دیا۔ یہاں سے "ماہی والا" ساڑھے تین کوس کے فاصلے پر تھا۔ مئی کے دن تھے۔ سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ ہوا بند ہونے کے باعث فضا میں گھٹن تھی اور زمین ہلکی ہلکی بھاپ چھوڑ رہی تھی درخت کی چھاؤں میں کھڑا میں کسی دیہاتی کا منتظر تھا جو مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے۔ سامنے بجلی کے کھمبے پر کسی انگریزی فلم کا اشتہار چسپاں تھا۔ فلم کا نام باریک الفاظ میں لکھا تھا لیکن ورجینا میو کا نام دور ہی سے دکھائی دے رہا تھا۔ ورجینا میو مجھے بہت پسند ہے۔ اس کی نیلی آنکھیں' سنہرے بال' سڈول جسم' لمبا قد' گویا سفیدے کا درخت ایک دیہاتی آ رہا تھا۔

"جوان ماہی والا گاؤں کدھر ہے؟"

جوان رک گیا۔ جوان پاؤں سے ننگا تھا اور جوتے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ تہمد کے پلو سے منہ پونچھ کر اس نے میری نئی سفید چپل کو دیکھا اور ایک طرف ہاتھ پھیلا کر بولا۔

"کھیتوں کھیت سیدھا راستہ" ماہی والے" کو جاتا ہے"

کھیتوں کھیت جو راستہ جا رہا تھا وہ بالکل ننگا تھا۔ دھوپ تیز ہو رہی تھی اور درخت خال خال دکھائی دے رہے تھے۔ دیہاتی آگے روانہ ہو پڑا۔ میں نے پہلے اپنی سفید چپل کو دیکھا پھر کھمبے کے ساتھ لگی ورجینا میو کو... خدا حافظ میری پیاری ورجینا! اور آگ برساتے سورج میں ساڑھے تین کوس کی مارچ شروع کر دی۔ رستہ کچا تھا اور گرد میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ کھیتوں میں کٹے ہوئے گیہوں کے بڑے بڑے گٹھے دھوپ میں پڑے تھے۔ کھیتوں میں کہیں کہیں میلے میلے کپڑوں والی عورتیں جھک جھک کر گیہوں کی بچی کچھی بالیاں چن رہی تھیں۔ ایک دو جگہ کھیتوں میں کھاد ڈالی جا رہی تھی اور بدبو سے دماغ خراب ہو رہا تھا۔ بمشکل ایک کوس چلا ہوں گا کہ جسم پسینے میں تر بتر ہو گیا اور آنکھوں سے سینک نکلنے لگا اور پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ رستے سے ذرا پرے ہٹ کر پیپل کی گھنی چھاؤں تلے رہٹ چل رہا تھا۔ وہاں جا کر کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پیا۔ میرے پاس ہی ایک بھینس بھی پانی پی رہی تھی۔ بھینس پانی پیتی رہی اور میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ کچھ دیر پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں تلے آرام کیا اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

دوسرے کوس پر گرمی نے برا حال کر دیا اور ورجینا میو یاد آ گئی جب وہ فلم میں برف پر سکی انگ کر رہی ہوتی ہے۔ میں نے جلدی سے قمیض اتار کر کندھے پر لٹکا لی۔ کچھ دور چلنے پر بنیان بھی اتارنا پڑی۔ اس لیے کہ حبس زیادہ ہو رہا تھا۔ اب صرف پتلون باقی رہ گئی تھی۔ اس کے پائینچے گھٹنوں تک چڑھا لیے۔ سفید چپل میں ریت اور مٹی گھس رہی تھی۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ دیہاتی لوگ شہر آتے

وقت جوتے ہاتھ میں کیوں اٹھا لیتے ہیں۔ تیسرا کوس ختم ہو رہا تھا کہ دور درختوں کے جھنڈوں تلے چند ایک کچے مکانوں کی دیواریں دکھائی دیں۔ تھوڑی دیر بعد میں گاؤں کنارے پہنچ گیا۔ یہی ماہی والا تھا۔ گندے جوہڑ کے کنارے ٹیڑھی بینگی دیواروں والے پانچ سات کوٹھے۔ آدھے جوہڑ کو بڑ کی پھیلی ہوئی شاخیں ڈھانپے ہوئے تھیں۔ کنارے کنارے ایک طرف گندگی کے ڈھیر دھوپ میں سڑ رہے تھے۔ ایک جگہ نیم کے سائے میں ایک نوجوان صرف تہمد باندھے تکیے میں بیٹھا' گھوڑے کی لگام مرمت کر رہا تھا۔ میں نے مکھن گوجر کا گھر پوچھا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ قمیض کندھے پر' جوتا ہاتھ میں' پتلون گھٹنوں تک' چہرے اور بالوں پر گرد کی تہہ جمی ہوئی۔ لیکن آخر میں پتلون پہنے ہوئے تھا۔ وہ نوجوان جلدی سے اٹھا اور مجھے مکھن گجر کے گھر لے گیا۔

مکھن گجر کوٹھری کے اندر چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آئینہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں موچنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور وہ گھور گھور کر ماتھے کے بال اکھیڑ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جلدی سے اٹھا اور بغل گیر ہو گیا۔

''کمال کر دیا یار' بھئی شام کو میرے ساتھ یکے پر آ جاتے۔''

مکھن کی ماں نے فوراً مٹی کے کوزے میں ستو' شکر اور پانی ڈال کر میرے لیے ستوؤں کا بڑا سا گلاس تیار کر دیا۔ مکھن کا مکان صرف ایک کوٹھری پر مشتمل تھا جس کی چھت جھکی ہوئی تھی اور دیواریں گرم بخارات چھوڑ رہی تھیں۔ فرش کچا تھا۔ ایک طرف لکڑی کا صندوق تھا اور قریب ہی زنگ لگے دو تین کنستر پڑے تھے۔ کونے میں اپلوں کا ڈھیر لگا تھا۔ چھوٹی سی کھاٹ پر مکھن کی دونوں چھوٹی بچیاں سو رہی تھیں اور ان کے منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ پرچھتی پر کانسی کے گول گول تھال' کٹورے اور دو ایک گندے لحاف رکھے ہوئے تھے۔ پرچھتی کے عین نیچے دودھ بلونے والی مٹکی پڑی تھی۔ دوسرے کونے میں دودھ کے برتن اور گھوڑے کے سامان کے پاس گیہوں کا چھوٹا ڈھیر لگا تھا۔ فضا میں حبس ہو رہا تھا اور پھٹے ہوئے دودھ ایسی باس اٹھ رہی تھی۔ اگرچہ مجھے پیاس لگ رہی تھی پھر بھی میں بمشکل ستوؤں کا آدھا گلاس ہی پی سکا۔

میں نے گلاس زمین پر رکھنے کا ابھی ارادہ ہی نہیں کیا تھا کہ مکھن جلدی سے بولا:

''ہے ہے یہ کیا؟ بھئی یہ سارا گلاس پینا پڑے گا۔ ابھی اور ستو باقی ہیں۔ آخر چار کوس پیدل چل کر آئے ہو۔''

ابھی اور ستو باقی ہیں؟ او مکھن! میرے اصلی مکھن!! ستوؤں کا کوزہ اٹھا لے۔ ویسے یہ جملہ میں نے اس سے کہا نہیں بلکہ شہر والوں کی طرح دل کی بات دل ہی میں رہنے دی اور منہ پر آئی ہوئی باتیں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد مکھن کی بیوی اپلوں کا پہاڑ سر پر اٹھائے ہوئے آ گئی۔ اپلے اس نے باہر دالان میں ڈھیر کر دیے اور مجھے دیکھتے ہی جلدی سے دوپٹہ درست کر لیا۔ سانولا رنگ بدن موٹاپے

کی طرف مائل۔ خاکی رنگ کی جالی دار قمیض جو پسینے میں بھیگ کر شانوں سے چپک رہی تھی۔ سرخ رنگ کی شلوار میلی ہو رہی تھی اور پائنچوں تلے ایڑیوں کا گوشت جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا کانوں میں باریک سنہری بالیاں تھیں اور کلائیاں ننگی تھیں۔ ساس نے ستوؤں سے بھرا ہوا دوسرا گلاس بہو کی طرف بڑھایا۔ بہو دہلیز میں بیٹھ کر ستو پینے لگی۔ کیا ورجینا میو بھی ستو پیتی ہے؟

شاید کیلیفورنیا میں بھی ستو ہوتے ہیں؟ مکھن نے اتنی دیر میں بڑی پریت سے حقہ تازہ کیا' چلم میں گڑ ملا کر سوکھا تمبا کو ڈالا اپلوں کی آگ جمائی اور حقے کی نے میری طرف بڑھا کر بولا۔

"پیو ذرا تمہاری جان کو ہوش آئے"

پہلا کش کھینچتے ہی چکر اور کھانسی کا وہ دورہ پڑا کہ ہوش آ گیا۔ مکھن نے مونچھوں کے سرے باٹتے ہوئے حقہ اپنی طرف کر لیا۔ وہ ہنس رہا تھا۔

"یار تم لوگ تو بس کاغذی حقہ ہی پی سکتے ہو۔"

بے شک ہم کاغذی حقہ پیتے ہیں' کاغذی بادام کھاتے ہیں' کاغذی علم حاصل کرتے ہیں اور کاغذی پھول سونگھتے ہیں۔ ہماری سب کارروائی کاغذی ہوتی ہے۔ میں نے جلدی سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ ورجینا تمبا کو سب سے بڑھیا تمبا کو ہے اور ورجینا میو سب سے بہترین ایکٹریس ہے۔ اور مکھن گوجر کی ورجینا میو باہر دھوپ میں بیٹھی چولہے میں آگ سلگا رہی تھی اور اپلوں کا کڑوا دھواں کوٹھڑی میں بھر رہا تھا۔ میں دستی پنکھا ہلانے لگا۔ دھواں دم بدم بڑھ رہا تھا۔ مگر مکھن اور اس کی ماں کو اس کا بالکل احساس نہ تھا گویا وہ اپلوں کا نہیں اگر بتیوں کا دھواں تھا۔ ایکا ایکی دونوں بچیاں ایک ساتھ رونے لگیں۔ مکھن کی ماں آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس نے بہو کو آواز دی۔ بہو نے چھوٹی کو اٹھا لیا اور بڑی کے آگے گڑ کی ڈھیلی پھینک دی۔ بچی کی ناک بہہ رہی تھی۔ اس نے گڑ اٹھا لیا اور چپ ہو گئی۔ وہ گڑ کھا رہی تھی اور مکھیاں اسے کھا رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ کھاٹ سے نیچے اتر آئی اور زمین پر رینگنے لگی۔ مکھن کی بیوی چولہے میں اور اپلے ڈال رہی تھی۔ اس کی ماں آٹا گوندھ چکی تھی اور کٹورے سے مکھن نکال کر چھنے میں ڈال رہی تھی۔ بیٹے نے کہا۔

"تولہ بھر مکھن تو دینا"

ماں نے چھٹانک بھر مکھن بیٹے کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اور بیٹا اسے مونچھوں پر ملنے لگا۔ جب مونچھیں اچھی طرح تر ہو گئیں تو اس نے منہ پر مالش شروع کر دی اور فضا میں پھٹے ہوئے دودھ کی باس اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ زیادہ تیز ہو گئی۔ بچی ساس کو پکڑا کر بہو نے بڑا سا توا چولہے پر ڈالا اور پرات اپنی طرف کھینچ کر بڑے بڑے پراٹھے پکانے شروع کر دیئے۔ ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ..... میں

نے پوچھا۔"اتنی ساری روٹیاں کس کے لیے پک رہی ہیں؟"

مکھن بولا۔

"بھئی اپنے لیے"

میں سہم گیا۔کیونکہ ہر پراٹھا ڈنلوپ ٹائر کے سائز اتنا تھا۔مکھن کی بچی نے زمین پر بیٹھے بیٹھے پیشاب کر دیا تھا اور اب اس میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے چھینٹیں اڑا رہی تھی۔دو ایک چھینٹیں مکھن کی چکنی مونچھوں پر پڑیں تو اس نے گرج کر کہا۔

"ہت سور کی جنی"

لڑکی سہم گئی۔لیکن ایک پل بعد پھر اپنے کھیل میں مشغول ہو گئی۔اب وہ آہستہ آہستہ میری سفید چپل کی طرف بڑھ رہی تھی۔چپل کے قریب پہنچ کر وہ ذرا رکی۔آنکھیں جھپکا کر چپل پر لگے ہوئے چمکیلے بٹن کو دیکھا اور پھر کیچڑ میں لت پت ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔مکھن حقے کا کش لگاتے ہوئے اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"بڑی شریر بچی ہے"میں نے چہرے پر بڑی میٹھی ہنسی پھیلا کر کہا۔"ہاں بڑی پیاری بچی ہے"

اور سفید چپل بھی بڑی ہی پیاری ہے...... کاش میں ننگے پاؤں یہاں آتا..... او مکھن گوجر کی پیاری بچی میری چپل پر رحم کھا۔ ابھی تو اس کی پہلی قسط بھی ادا نہیں کی.....

اتنے میں پراٹھے تیار ہو گئے اور ٹائروں سے بھری ہوئی چنگیر ہمارے درمیان رکھ دی گئی۔پانی کی جگہ صبح کی کھٹی لسی آ گئی اور سالن کی جگہ گڑ کی ڈھیلی..... آدھا ٹائر بمشکل کھانے کے بعد میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور ساتھ ہی سانس بھی۔

مکھن اور اس کی ماں نے مجھے بہتیرا مجبور کیا' مگر مجھے زندگی بڑی عزیز تھی۔روٹی کے بعد مکھن چارپائی پر لیٹ گیا اور حقہ گڑاتے ہوئے بولا۔

"اب سناؤ کشمیر ملے گا یا نہیں؟"

کشمیر ملے گا ضرور ملے گا مکھن..... مگر خدا کے لیے مجھے اپنی چپل ذرا بچانے دو۔چنانچہ میں نے پاؤں سے چپل ذرا اور آگے کھسکا لی۔بچی نے مجھے گھور کر دیکھا اور آگے سرکنے لگی۔اب ساس بہو کے کھانے کا وقت تھا۔کھانے سے فارغ ہو کر بہو نے برتن سنبھالے۔زمین پر پرلی طرف منہ کر کے لیٹی اور بچی کو دودھ پلانے لگی۔تھوڑی دیر بعد اس کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر عورت کو خراٹے لیتے نہیں سن سکتا۔کہاں عورت' کہاں خراٹے؟ کہاں راجہ بھوج' کہاں گنگو تیلی

.....یہ بالکل ایسی بات ہے جیسے کوئی رومن کیتھولک راہبہ چنگڑ محلے میں کسی دوکان کے باہر بیٹھی مرمرا کھا رہی ہو۔ مکھن کی بیوی مرمرا کھا رہی تھی۔ کچھ وقت گزرنے پر مکھن کی ماں بھی مرمرا کھانے لگی۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ مکھن صاحب بھی نیند کے جھولے میں ڈولنے لگے ہیں' حقے کی نے خودبخود اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ بھی خراٹے لینے لگا۔ میدان صاف دیکھ کر میں نے جلدی سے اپنی چپل اٹھائی اور جوڑ کر چارپائی کی پائنتی پر رکھ دی۔ بچی میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور گڑ کھانے لگی۔ کوٹھڑی میں خراٹوں کی آوازیں گونج رہی تھیں اور محسوس ہو رہا تھا کہ میں بھی خراٹے لے رہا ہوں۔ دروازے میں سے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ کٹے ہوئے کھیت چلچلاتی دھوپ گرم لو۔ زمین میں سے گرم گرم بھاپ کی کانپتی ہوئی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ لو کے جھلسے ہوئے مدھم جھونکوں میں چپ چاپ کھڑے درختوں کی ٹہنیاں بے معلوم انداز میں ہل رہی تھیں۔ قریب ہی کسی جگہ کوئی شخص اک تارے کے ساتھ یوسف زلیخا پڑھ رہا تھا۔ اس کی آواز کاہل اور اداس تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ لوگوں کو جنازہ کی طرف بلا رہا ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک گرد کا پھیکا پھیکا بادل سا پھیلا ہوا تھا۔ ہر شے خاموش اور چپ تھی۔ سنگین وجان بلب تھی۔ رک گئی تھی' تھم گئی تھی...... وقت ہونٹوں پر انگلی رکھے بت بنا کھڑا تھا۔ جن میں دیہاتی زندگی کی رنگینیوں کو چٹخارے لے لے کر بیان کیا گیا تھا۔ اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ان کہانیوں کے تمام مصنفوں کو ماہی والا میں جلاوطن کر دوں۔

ہائے شہر...... اور شہروں کی زندگی!

کافی ہاؤس میں اس وقت میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ شعروادب پر گفتگو کر رہے ہوں گے۔ کولڈ کافی کے ساتھ سگریٹ اڑا رہے ہوں گے۔ کھڑکیوں اور دروازے پر نیلے پردے گرے ہوں گے اور کمرے میں آنکھوں کو ٹھنڈک بخشنے والا ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہو گا اور فضا میں کافی اور سگرٹوں کی لطیف خوشبو مخلوط ہو رہی ہو گی۔

اور یہاں کیا ہے؟ محض اپلے' خراٹے اور یوسف زلیخا......

لو چل رہی ہے' کھیت بخارات چھوڑ رہے ہیں' جوہڑ کنارے گندگی کے ڈھیر سڑ رہے ہیں' درختوں پر جانور سو رہے ہیں۔ سکوت' جمود' موت!!

مال' لارنس' میکلوڈ...... ریگل میں کیا لگا تھا؟ میں نے غلطی کی جو یہاں چلا آیا۔ کیا معلوم ورجینا میو کی فلم کا آج آخری دن ہو۔ ورجینا کا جسم کس قدر سڈول ہے اور اس کے ہونٹ کتنے دلاویز ہیں۔ اور مکھن کی مونچھیں کس بری طرح چپڑی ہوئی ہیں اور اس کی بیوی کس قدر ڈراؤنے انداز میں خراٹے لے رہی ہے۔ کیا اس نے ورجینا میو کو سوتے ہوئے نہیں دیکھا؟ اسے کیا پتہ کہ جب وہ سو جاتی

ہے اور نیند کتنی جلدی آ جاتی ہے۔ مگر یہ تو بے حد بے ربط جملہ ہے۔ کیا مجھے نیند آ رہی ہے؟ اور اس کے بعد میں بھی سو گیا۔ تیسرے پہر آنکھ کھلی تو سائے قدرے بڑھ گئے تھے مگر سورج اسی طرح آگ برسا رہا تھا۔ مکھن کا لڑکا جس کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہ تھی پٹواری کے ہاں سے پڑھ کر آ گیا تھا۔ وہ صرف ایک چھوٹے سے تہمد میں تھا اور گرمی کے مارے اس کی آنکھ سرخ ہو رہی تھی جسے وہ بار بار ہتھیلی سے مل رہا تھا۔

ماں بیٹے کو پہلو میں بٹھلائے روٹی کھلا رہی تھی۔ نہ معلوم بیٹے نے کیا کیا کہ ماں نے زور سے اسے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ لڑکا غصہ کھا کر اٹھا اور ماں کو موٹی سی گالی دے کر باہر بھاگ گیا۔ ماں چمٹا اٹھا کر پیچھے ہولی۔

مکھن ہنسنے لگا۔ ہی ہی ہی۔

مکھن کی ماں بھی ہنسنے لگی۔

چنانچہ میں ہنسنے لگا۔ آہا! دیہاتی زندگی کتنی سادہ اور دلچسپ ہے! ماں بیٹے کو گالی دے رہی ہے۔ بیٹا ماں کے باپ کو گالی دے رہا ہے۔ ماں چمٹا لیے بیٹے کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی ہے تاکہ اسے پکڑ کر اس کا سر لہولہان کر دے۔ باپ حقہ پی رہا ہے کہ اس کا بیٹا بڑا ہو گا۔ آپ کھائے گا اسے بھی کھلائے گا!! کیوں نہ ہو آخر وہ بھی تو کبھی بیٹا تھا.... کاش مجھے اردو کی پہلی کتاب کا مصنف مل جائے اور میں چمٹا مار کر اس کا سر لہولہان کر دوں۔

دن ڈھلے جب مکھن نے دودھ شہر لے جانے کے لیے گھوڑا جوتا تو میں اچھل کر اس میں بیٹھ گیا۔

"ارے..... بھئی ایک رات تو رہ جاتے۔"

لیکن میں کیسے رہتا۔ مجھے کوئی شے یقین دلا چکی تھی کہ ریگل میں ورجینا میو کی فلم کا آج آخری شو ہے۔ اور جس وقت میں نے شہر کی پتھریلی اور تارکول والی سڑک پر قدم رکھا تو مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میں ریگل کے سینما ہال میں آ گیا ہوں۔

◆◆◆

خزاں کا گیت

میری محبت اس گھاس کی مانند ہے جو اونچے پہاڑوں کی گہری گھاٹیوں میں اگتی ہے۔اور جو روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے مگر جس کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔

(ایک جاپانی گیت)

''ہمارا فوجی ریڈیو سٹیشن اوکایاما شہر سے باہر واقع تھا''

احسان نے پائپ سلگاتے ہوئے کہا۔

کمرے میں تازہ انگریزی تمباکو کی دھیمی دھیمی خوشبو پھیل گئی۔یہ کمرہ قصبے میں ان کی اپنی حویلی کے پچھواڑے نہر کے قریب ہی تھا۔نہر خشک تھی اور اس میں درختوں پر سے گرے ہوئے پتر بکریاں چر رہی تھیں۔خزاں کا چل چلاؤ تھا۔آسمان کو پھیکے اور پژمردہ بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ہوا بند تھی اور کھلی کھڑکی میں سے امرودوں اور ناخوں کا باغ دکھائی دے رہا تھا جو اجڑ چکا تھا اور جہاں درختوں پر بچے کھچے پتوں کی رنگت گلابی ہو رہی تھی۔ہم آرام کرسیوں پر نیم دراز تھے۔ہمارے پاس ہی روسی طرز کا چھوٹا سماور پڑا تھا جس میں مدھم آنچ پر چائے کے لیے پانی گرم ہو رہا تھا۔میرا دوست پائپ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

''جس جاپانی لڑکی کی داستان زندگی بیان کرنے لگا ہوں اس کا اصلی نام شی زوکو تھا۔لیکن اس کے گال بڑے خوبصورت تھے اور ہنستے وقت وہاں اس سے زیادہ خوبصورت گڑھے پڑ جایا کرتے تھے اس لیے میں اسے ڈمپل کہا کرتا تھا۔تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمارا ریڈیو سٹیشن اوکایاما شہر سے باہر واقع تھا۔لمبی چوڑی سڑکوں دلفریب بلند و بالا سنگین عمارتوں اور سرسبز و شاداب باغوں والا یہ شہر ٹوکیو کے بعد جاپان کا تیسرا یا چوتھا خوبصورت ترین شہر ہے۔ریڈیو سٹیشن کی عمارت کے ارد گرد چیری' صنوبر اور شہتوت کے درختوں کے جھرمٹ تھے۔ان کے بیچوں بیچ درختوں کو کاٹ کر ایک چھوٹی سی سڑک بنا دی گئی تھی جو ہمیں شہر سے ملاتی تھی۔جاپان جنگ ہار چکا تھا اور اس ریڈیو سٹیشن سے امریکی فاتحین کی فراخدلی' انصاف پسندی اور جمہور نواز کے گن گائے جاتے تھے۔ہمارا دفتری عملہ چار پانچ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ایک جاپانی مترجم' چپڑاسی' دو حوالدار کلرک' میں اور ایک ہمارا آفیسر کمانڈنگ افسر... جس کا اصلی نام میں نہیں

بتاؤں گا۔ یوں سمجھ لو ہم اسے بن غازی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ میجر بن غازی جہلم کا رہنے والا ایک سپاہی قسم کا آدمی تھا۔ جسے اراکان کے محاصرے پر کسی انگریز افسر کی جان بچانے کے صلے میں میجری مل گئی تھی۔ اس کی عمر چالیس سے کچھ اوپر تھی لیکن سرخ رنگت' لمبے قد' چوڑے شانوں اور ہر وقت مسکراتے رہنے کی وجہ سے وہ خواہ مخواہ جوان معلوم ہوتا تھا۔ اسے پیری فقیری سے بھی لگاؤ تھا۔ دفتر میں سارا دن سہ حرفی اللہ دتہ پڑھنے اور ملتانی کافیوں کے ریکارڈ سننے کے سوا اسے کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ پروپیگنڈا اور صحافت کی اسے کوئی شدھ بدھ نہ تھی۔ جانے وہ کیوں کر براڈ کاسٹنگ میں دھکیل دیا گیا تھا۔ میں چونکہ اس سے پیشتر بھی جنگ کے دنوں میں سنگاپور اور رنگون سے فوجی پروگرام کر چکا تھا اور علاوہ ازیں مجھے کچھ اخباری زندگی کا تجربہ بھی تھا۔ چنانچہ میجر بن غازی نے موقع کی نزاکت دیکھ کر براڈ کاسٹنگ کا سارا کام مجھے سونپ دیا تھا۔ اسے اس بات کا پورا احساس تھا کہ لیفٹنٹ احسان کے بغیر ریڈیو پروگرام کا جاری رہنا ناممکن ہے۔ اس لیے اسے میرا بڑا خیال رہتا تھا اور اس نے مجھے اپنا چھوٹا بھائی بنا لیا تھا۔ اگرچہ مجھے بڑے بھائی کی بالکل ضرورت نہ تھی اور میں اپنا کام ڈیوٹی سمجھ کر ادا کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں مجھے بن غازی سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہ تھی۔ ایک روز اس نے مجھے ہفتہ بھر کا پروگرام ٹائپ کرتے دیکھا تو بولا۔

''ارے.... یہ کام بھی تم خود کرتے ہو؟''

''حوالدار نائیر چھٹی پر ہے''

میجر بن غازی نے حسب عادت دو تین مرتبہ ناک سکیڑ کر سوں سوں کیا اور بولا۔

''اس کا مطلب ہے ایک فالتو ٹائپسٹ بھی ہونا چاہیے.... بہت خوب کل ہی اس کا بندوبست کیا جائے گا۔ ارے ہاں یاد آیا ...پچھلے دنوں ایک لڑکی میرے گھر آئی تھی۔ اسے ملازمت کی ضرورت تھی۔ وہ ٹائپ کرنا بھی جانتی ہے۔ میرے خیال میں اسے بلا لیا جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''جناب مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں.... آپ جسے چاہیں بلا لیں''

میجر بن غازی نے ہنستے ہوئے ناک سکیڑی۔

''سوں سوں... چن جی بھلا دلچسپی کیسے نہ ہو''

دوسرے روز میں دفتر آیا تو میجر بن غازی کے پاس ایک دبلی پتلی جاپانی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھی اور گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھے اور جھک کر بولی۔

”گڈمارنی سر“

میجر بن غازی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر انگلی پھیرتے مسکرا رہا تھا۔

”دیکھو چن جی.. یہ ہے مس شیزو کو یعنی تمہاری نئی ٹائپسٹ اور میں نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔“

بن غازی مس شی زو کو کے کندھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔لڑکی شرما کر دوہری ہو گئی۔اس کا ملائم بادامی رنگ کے بالوں والا سر اور جھک گیا اور زرد چہرے پر حیا کی لالی دوڑ گئی۔بن غازی اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور اس کی گول گول پیشانی کے چوکھٹے میں لمبی سلوٹیں خطرہ گیارہ ہزار وولٹ کے سرخ حروف بنا رہی تھیں۔اس دن ڈمپل دفتر آئی تو اس کا لباس پہلے سے زیادہ خوبصورت تھا۔زرد رنگ کے پھولدار سائے پر ہلکے رنگ کا اونی سویٹر اور اس پر سفید رنگ کا ریشمی مفلر... ڈمپل کا زرد رنگ ان شوخ رنگوں سے مل کر زیادہ شوخ ہو رہا تھا۔دروازے پر ہی کھڑے ہو کر اس نے دونوں ہتھیلیاں گھٹنوں پر رکھیں اور جھک گئی۔

”گڈمارنی سر“

میجر بن غازی ہزار سال پہلے کی بھدی مصوری کے چند نمونے میز پر پھیلائے ان پر جھکا ہوا تھا۔ڈمپل کی باریک اور مترنم آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا اور اس کی گول گول پیشانی پر ہزار وولٹ کا خطرہ ابھر آیا۔

”اخاہ... میری پیاری پیاری بچی آ گئی؟“

صبح ہی سے پیاری بچی کے لیے ایک چھوٹی میز اور کرسی کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔بن غازی اپنی بچی کی کمر میں بازو ڈالے اسے میز کے قریب لے آیا۔

”میری بچی آج سے یہاں بیٹھے گی۔“

ڈمپل کرسی پر بیٹھ گئی۔بن غازی میز پر ٹائپ کی مشین رکھوا کر میری طرف مڑا۔

”چن جی کوئی کام ہو تو اسے دے دو“

میں نے پروگریسو رپورٹ نکال کر اسے پکڑا دی۔

”اس کی چھ کاپیاں ہوں گی۔“

ڈمپل نے رپورٹ کو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں لے کر پڑھا اور پھر مشین پر کاغذ چڑھا کر ٹائپ کرنے لگی۔

ٹک ٹک.. ٹک ٹک ٹک۔

اس کی رفتار مدھم تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ ابھی مشق کر رہی تھی اور محض حالات کی نزاکت نے اسے جلدی نوکری کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں کی طرح جاپان میں بھی حالات کی نزاکت بہت پائی جاتی ہے اور یہ نزاکت اکثر اوقات اتنی نازک ہو جاتی ہے کہ معصوم غریب لڑکیوں کو نہ صرف نوکری بلکہ بعض اوقات اپنے جسم بیچنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔ بن غازی نے ڈمپل کی چھوٹی چھوٹی انگلیوں کو دیکھا جو رک رک کر چل رہی تھیں مگر اب وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس نے اس لڑکی کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا اور اگر ڈمپل زیادہ ٹائپ نہیں کر سکتی تھی تو کیا ہوا وہ مسکرا تو سکتی تھی۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے گول اور ملائم رخساروں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ جاتے جو اس کے باپ کو بڑے پسند تھے۔ میجر بن غازی نے ہنستے ہوئے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے سر ہلا دیا جیسے کہہ رہا ہو۔

''کوئی بات نہیں چن جی.... آہستہ آہستہ سیکھ جائے گی۔''

میرے دفتر میں ڈمپل کی اہمیت حوالدار کلرکوں ایسی تھی' جن کا کام دفتر وقت پر آنا اور وقت پر چلے جانا تھا۔ ڈمپل بلا ناغہ ٹھیک وقت پر دفتر کے دروازے پر نمودار ہوتی۔ جھک کر سلام کرتی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنی میز پر جا بیٹھتی۔ دن بھر خاموشی اور کبھی کبھی دفتری گفتگو کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہتی۔ پانچ بجے شام جھک کر سلام کرتی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی دفتر سے باہر نکل جاتی۔ دفتری کام کے علاوہ وہ کسی سے بات نہ کرتی میرے لیے اگر ڈمپل کی موجودگی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی تو ڈمپل نے بھی کبھی مجھ سے کھل کر بات کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ میجر بن غازی دن میں تین چار مرتبہ اس کے نرم نرم بالوں کو سہلانا اور پیار سے پیٹھ پر تھپتھپا دینا نہ بھولتا۔ اپنے بالوں اور پیٹھ پر باپ کے ہاتھ لمس محسوس کرتے ہی ڈمپل کے چہرے کی رنگت بدل جاتی اور وہ اپنے شانے سکیڑ کر اکٹھی سی ہو جاتی۔ میں جانتا تھا ڈمپل کو اپنے ''باپ'' کی یہ حرکت بالکل ناپسند ہے لیکن میں نے بن غازی کو کبھی کچھ نہ کہا تھا۔ پھر بھی مجھے اس وقت ڈمپل کے ساتھ کچھ ہمدردی سی ہو جاتی تھی۔ ڈمپل کے معاملے میں یہ ہمدردی کا احساس کوئی انوکھی اور پر اسرار بات نہ تھی۔ جاپان کے اس بہت بڑے صنعتی شہر کے غریب واڑوں اور گنجان ترین آبادی کی پر پیچ گلیوں میں سے گزرتے ہوئے' لکڑی اور بانس کے پچکے ہوئے مکانوں کی گھٹی گھٹی فضا میں لڑتی جھگڑتی عورتوں اور منہ بسورتے زرد رو گندے بچوں کو دیکھ کر یہ احساس میرے دل میں کئی بار جنم لے چکا تھا اور میں اسے ہر بار دبا دیا کرتا تھا۔ اس احساس ہمدردی کے حصے دار ہمارے دونوں مداری کلرک تھے جنہیں روٹی کی تلاش مقناطیس کی مانند کھینچتی ہوئی وطن سے ہزاروں میل دور اجنبی اور ناواقف لوگوں میں لے آئی تھی اور جن کے کمزور سیاہ اور پژمردہ چہروں پر ہر وقت اس ہزاروں میل لمبی دیوار کا سایہ رہتا تھا۔ جو ان کے وطن اور ان کے درمیان کھچی ہوئی تھی۔ رزق کی دیوار' بھوک کی دیوار.... اسی دیوار کے سائے میں وہ دونوں کلرک تھے' ڈمپل تھی' ہمارا بوڑھا جاپانی

مترجم تھا اور اوکایاما کے غریب واڑے تھے۔ ایک مہینہ چپ چاپ گزر گیا۔

اس دوران میں ڈمپل کسی سے گھل مل نہ سکی۔ میجر بن غازی اسے کئی چیزیں بطور تحفہ دے چکا تھا جنہیں لاکھ انکار کے باوجود وہ قبول کرنے پر مجبور ہوگئی تھی مگر بن غازی کے ہاتھ ڈمپل کے کندھوں سے آگے نہ بڑھ پائے تھے۔ بلکہ ڈمپل کی بے نیازی اور کبھی کبھی ہلکی سی مدافعانہ کوشش نے اسے "باپ" کی محبت بھری تھپکیوں سے بھی محروم کر دیا تھا۔ میرے لیے ڈمپل کے کردار کا یہ مضبوط پہلو توجہ اور دلچسپی کا باعث تھا۔ مجھے بن غازی ناپسند تھا اور ناپسندیدگی کی یہی لہر ڈمپل کے دل میں ابھرتے دیکھ کر میں خود بخود ڈمپل کے قریب پہنچ گیا تھا۔ شاید اس قرب اور آہنگ کو ڈمپل بھی محسوس کرنے لگی تھی' ایک روز جبکہ نومبر کی نیلگوں دوپہر روشن اور چمکیلی تھی میں کینٹین سے بسکٹ اور چاکلیٹ لے کر دفتر میں آیا ڈمپل حسب عادت کام میں مشغول تھی۔ چاکلیٹ میں نے دفتر میں بانٹ دیئے۔ ایک سٹک ڈمپل کو بھی دی۔ اس نے شرما کر مسکراتے ہوئے سٹک لے کر میز کے دراز میں رکھ لی اور کوئی شکریہ وغیرہ ادا نہ کیا۔ میں نے سوچا لڑکی گنوار ہے۔

جیسا کہ تم جانتے ہو مجھے بے مقصد سیر سپاٹوں سے کبھی لگاؤ نہیں رہا۔ چنانچہ اوکایاما کی سڑکوں اور باغوں کے چکر لگانے کی بجائے میں چھٹی کے بعد بھی دفتر ہی میں بیٹھا کتابیں اور رسالے وغیرہ پڑھتا رہتا تھا۔ بعض اوقات ڈمپل بھی وہیں رک جاتی اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ ٹائپ کی مشق کرتی رہتی۔ جس کی میں نے اسے اجازت دے رکھی تھی۔ ڈمپل کو چاکلیٹ دینے کے دوسرے روز بعد جبکہ دفتر میں تقریباً تنہا تھے وہ کرسی پیچھے کھسکا کر اٹھی۔ میرے قریب آئی اور سرخ رنگ کا چھوٹا سا ڈبہ میری میز پر رکھ کر واپس چلی گئی۔ میں نے کتاب بند کر دی۔

"یہ کیا ہے شی زو؟"

میں نے جلدی سے ڈبہ کھولا اندر کپڑے کی خوبصورت گڑیا لیٹی نیلی آنکھوں سے مجھے تک رہی تھی۔ اس قسم کی گڑیا تم نے کبھی نہ کبھی ضرور کسی کار کے پچھلے شیشے پر جھولتی دیکھی ہوگی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

"میں بچہ نہیں ہوں شی زو"

ڈمپل نے ہنستے ہوئے اپنا سنہری سر ٹائپ رائٹر کے پیچھے چھپا لیا۔ میں گڑیا کو ڈوری سے پکڑ کر لہرانے لگا۔

"ارے اس کی شکل تو تجھ سے بہت ملتی ہے.... مگر شی زو یہ تمہیں کیا سوجھی؟"

ٹائپ رائٹر کے عقب سے آواز ابھری۔

"جاپانی اسی طرح شکریہ ادا کرتے ہیں جناب"

"مگر میجر بن غازی کا تم نے کبھی اس طرح شکریہ ادا نہیں کیا"

ڈمپل تن سی گئی۔ اس نے سر جھٹکا کر تلخ لہجے میں کہا۔

"مجھے ایسی باتیں ناپسند ہیں جناب"

اور وہ جلدی جلدی ٹائپ کرنے لگی۔ بے بس لڑکی وہ کہنا چاہتی تھی مجھے بن غازی ناپسند ہے جناب۔ مجھے اس سے نفرت ہے جناب' مگر وہ نہ کہہ سکی۔ وہ کبھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ ڈمپل کو بن غازی ناپسند تھا مگر اس کے بوڑھے دادا کو چائے بڑی پسند تھی۔ اس کی ادھیڑ عمر ماں کو روٹی بڑی پسند تھی اور ان کے مالک مکان کو ہر پہلی کا کرایہ بڑا پسند تھا۔ ڈمپل خاموش ہو گئی اور میں کتاب کھول کر ڈمپل کے متعلق سوچنے لگا۔ میں جیسے جیسے اس کے بارے میں سوچتا میرے دل میں اس دبلی پتلی' کمزور اور غریب لڑکی کی عزت بڑھتی جاتی اور مجھے اس کے کردار کا سب سے نازک اور کمزور پہلو سب سے اہم اور مضبوط محسوس ہونے لگتا۔ ایک دفعہ میں نے اس سے پوچھا۔

"شی زو! تم کہاں رہتی ہو؟ تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟"

اور ڈمپل نے ٹائپ کی مشق کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ اس کا باپ مدت ہوئی گھر بار چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ اور ہمیشہ نئی نئی عورتوں کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ہوٹل کی ایک اطالوی باورچن سے چھپ چھپا کر شادی رچا لی اور کہیں روپوش ہو گیا۔ سات سال سے اس نے گھر کا منہ نہیں دیکھا۔ اب وہ شہر کے مشرقی علاقے کی ایک تنگ سی گلی میں اپنی ماں' بوڑھے دادا اور چھوٹی بہن کے ساتھ رہتی ہے۔ میں نے پوچھا۔

"مگر شی زو اس قلیل تنخواہ میں تمہارا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟"

"جناب ہم کسی نہ کسی طرح گزارہ کر ہی لیتے ہیں۔ ہم نے اپنے مکان کا نچلا حصہ ایک چائے کمپنی کو دے رکھا ہے جسے وہ بطور گودام استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح مکان کا کرایہ بھی آسانی سے نکل جاتا ہے۔"

ڈمپل خاموش ہو گئی وہ ٹائپ کرتی رہی اور میں کتاب کھولے سوچتا رہا۔ ایک پورے گھرانے کا خرچ اس کمزور لڑکی کے کندھوں پر تھا اور ڈمپل کے کندھے نازک تھے۔ اگرچہ اس کے باریک ہونٹ گلاب کی پتیوں جیسے تھے اور اس کی تنخواہ قلیل تھی اور وہ گلاب کی پتیوں کو امریکی' برطانوی اور ہندوستانی سپاہیوں سے بچا کر رکھنا چاہتی تھی' لیکن جاپان کی معاشی حالت ان پتیوں سے بھی زیادہ نازک تھی۔ ڈمپل کب تک اس پھول کو شاخوں میں چھپا کر رکھ سکے گی؟ وہ ناتواں جاپانی لڑکی اس کی حفاظت نہ کر سکتی تھی لیکن میں نے

پھول کی حفاظت کا فیصلہ کر لیا۔

میں چائے کا عادی نہیں ہوں مگر میں نے اپنے ہاؤس بوائے کو دن میں دو مرتبہ دفتر میں چائے لانے کا حکم دیا۔ جاپان کے نچلے متوسط طبقے میں چائے پانی کی طرح پی جاتی ہے لیکن اوکایاما میں چینی صرف بورڑ واطبقہ اور فوج میں استعمال کی جاتی تھی۔ نہ جانے باقی لوگ پھیکی' کڑوی اور کسیلی چائے کس طرح پی جاتے تھے' پہلے ہی روز میں نے چائے کی پیالی اور بسکٹ ڈمپل کو دیئے تو اس نے جھجکتے ہوئے پیالی پکڑ لی۔ وہ خاموشی سے چائے کے ساتھ بسکٹ کھانے لگی۔ اگرچہ وہ آہستہ آہستہ کھا رہی تھی مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ڈمپل کئی روز سے بھوکی تھی' دوسرے ہفتے میں کینٹین سے واپسی پر دس پونڈ چینی ساتھ لیتا آیا' سارا دن وہ ریکارڈوں کی الماری میں پڑی رہی۔ شام کو ڈمپل ٹرک پر بیٹھ کر گھر جانے لگی تو میں نے چینی سے بھرا ہوا تھیلا اس کے ساتھ رکھ دیا۔ ڈمپل نے تعجب سے مجھے دیکھا۔

''یہ کیا ہے جناب''

''اسے گھر جا کر کھولنا جناب''

ڈمپل ہنس پڑی۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ اور ٹرک روانہ ہو گیا اور ڈمپل موڑ گھومنے تک مجھے متبسم نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ صبح دفتر میں داخل ہو کر اس نے جھک کر'' گڈ مارنی سر'' کہا اور میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میجر بن غازی ابھی نہیں آیا تھا۔ میں نے اخبار ہٹا کر کہا۔

''کیا بات شی زو''

جناب آپ نے کل جو چینی دی تھی۔ میری ماں بہت شکریہ ادا کرتی ہے۔ اس نے پوچھا ہے آپ پھیکی چائے کس طرح پئیں گے؟''

''میرے پاس چینی ہے شی زو''

''پھر بھی جناب..... میری ماں.....''

ڈمپل رک گئی جیسے الفاظ ڈھونڈ رہی ہو۔ الفاظ نہ ملنے پر اس نے اپنا چھوٹا سا بٹوہ کھولا اور اس میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ دوسرے لمحے اس نے ایک لفافہ نکال کر میرے آگے رکھ دیا اور خود جلدی سے اپنی میز پر جا کر بیٹھ گئی۔ میں نے لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک اور ریشمی گڑیا نکل آئی لیکن یہ گڑیا اس روز والی گڑیا سے زیادہ خوبصورت اور چھوٹی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے ڈمپل کی طرف دیکھا اور

وہ اپنا چہرہ ٹائپ رائٹر کے پیچھے چھپائے ہوئے تھی۔ بوڑھا جاپانی مترجم اندر داخل ہوا میں نے گڑیا دراز میں رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیوں جناب جاپان میں لڑکیاں بڑی ہو کر بھی گڈیوں سے پیار کرتی ہیں؟"

بوڑھا مترجم پہلے تو ہکا بکا سا رہ گیا۔ پھر کھسیانا ہو کر مسکرانے لگا۔ ڈمپل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

ڈمپل آہستہ آہستہ مجھ سے کھل رہی تھی۔ وہ دن میں کئی بار میری میز پر آ کر مجھ سے پوچھتی۔

"جناب یہ لفظ کیا ہے"

"جناب اس فائل کا نمبر Missing ہے"

"ٹائپ ٹھیک ہے نا جناب؟"

میجر بن غازی کا کمرہ اگرچہ پردہ سے ڈھکا ہوا تھا مگر وہ اپنی "بیٹی" کی پوری طرح خبر گیری کر رہا تھا۔ تاہم وہ مجھے کچھ نہ کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ اوکایاما میں ہزار سال پہلے کی قدیم تصویریں زنگ خوردہ پرانی چھریاں اور مہاتما بدھ کے وقتوں کے برتن اکھٹے کرنے آیا تھا اور میں فوجی پروگرام کرنے۔ اگر میں خوش ہوں تو وہ چاقو چھریاں' پیالے صراحیاں اور تصویریں بھی جمع کر سکتا تھا اور فوجی پروگرام بھی باقاعدہ ہو سکتا تھا۔ ایک دن بڑے پیار ے سے میرا کندھا دبا کر کہنے لگا۔

"چن جی! کسی وقت سیر کرنے کو بھی نکل جایا کرو۔ ذرا جی بہل جاتا ہے"

"بن غازی صاحب مجھے اس کی عادت نہیں۔"

بن غازی نے ناک سکیڑی۔

"سوں' سوں.... میں جانتا ہوں تم اداس رہتے ہو۔ ہاں میاں وطن سے دور.... اور پھر تنہا۔ آدمی اداس نہ ہو تو پھر کیا ہو۔ مجھے ان باتوں کا خوب تجربہ ہے۔ میاں کئی سالوں سے کمان افسری کر رہا ہوں.... دیکھو! تم کوئی ہاؤس گرل کیوں نہیں رکھ لیتے ؟"

مجھے اس کی بات سخت ناگوار لگی لیکن میں درگزر کر گیا۔

"معاف فرمائیں۔ میرے پاس ہاؤس بوائے موجود ہے۔"

بن غازی اور جھک کر آہستہ سے بولا۔

"میاں سپاہی دنیا میں صرف دو ہی چیزوں سے محبت کرتا ہے۔ پہلی عورت اور دوسری چھٹی' تمہارے پاس نہ عورت ہے اور نہ تم

چھٹی انجوائے کرتے ہو۔"

"مجھے نہ عورت کی ضرورت ہے نہ چھٹی کی.... عورت فریب دیتی ہے اور چھٹی...."

میجر بن غازی نے میری بات کاٹی۔

"عورت اور فریب؟ میاں مرد میں طاقت ہونی چاہئے۔ مجال ہے کسی عورت کی کہ وہ دوسرے کا رخ پکڑے ابھی بچے ہو چن جی۔ عورت بڑی ضروری شے ہے۔ ارے یہ تو تمہارا راشن ہے تم عورت کو کیا جانو۔ وہ چھ بچوں کی ماں ہو کر بھی عشق کر سکتی ہے۔ مجھے ان باتوں کا خوب تجربہ ہے۔ تم ایک ہاؤس گرل ضرور رکھو اور اگر تم چاہو تو یہ لڑکی.... کیا نام... شی زوکو..."

"معاف کیجئے میں ایسی باتیں نہیں سنا کرتا" میں نے غصے میں کہا۔ بن غازی ہنس پڑا۔

"میاں ناراض کیوں ہوتے ہو؟ غالب کا وہ شعر نہیں سنا کہ

دریائے عشق میں اپنا مقام پیدا کر

کہ تو بھی اک نئی صبح اک نئی شام پیدا کر

چن جی! پیدا کرو... کچھ نہ کچھ پیدا کرو... اور عورت کے بغیر تنہا کچھ پیدا نہیں ہو سکتا۔"

میجر بن غازی سوں سوں کرتا' ناک سکیڑتا اپنے کمرے میں چلا گیا اور میں نے سگریٹ راکھ دان میں مسل دیا۔

گفتگو چونکہ پنجابی میں ہوئی تھی لہٰذا ڈمپل کی سمجھ سے باہر تھی ویسے وہ اپنا نام سن کر چونکی سی ہو گئی تھی۔ اور اس نے میری گفتگو کے تلخ لہجے کو بھی محسوس کر لیا تھا۔ شام کو دفتر سے نکلتے ہوئے میں نے اسے بن غازی کی تمام باتیں سنائیں۔ تو وہ بہت ہنسی۔ اس نے بھولے پن سے سر ڈھلکا کر کہا۔

آپ مجھے ہاؤس گرل کیوں نہیں رکھ لیتے۔ میں آپ کو کھانا بھی پکا دیا کروں گی"

میں نے کہا۔

تم ہاؤس گرل بننے کے لیے نہیں ہو"

پھر کس لیے؟

ٹائپ کرنے کے لیے۔ ڈمپل ہنس پڑی۔

ٹائپ کرنا تو مجھے ابھی تک نہیں آیا۔

ہم ٹرک کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ڈمپل ٹرک میں سوار ہو گئی امریکن سیکشن کی لڑکیاں بھی آ گئیں۔ ٹرک چل پڑا ڈمپل نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''سایونارا'' (خدا حافظ)

میں نے بھی ہاتھ ہلایا۔

''سایونارا'' ٹرک صنوبر، شہتوت اور چیری کے درختوں تلے موڑ گھوم گیا۔

صبح دفتر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کسی نے میز پر بچھے ہوئے سفید سیاہی چوس پر سرخ اور سیاہ روشنائی کی مدد سے بلی کا بڑا سا سر بنا دیا ہے۔ میں متعجب کھڑا تھا اور ڈمپل ٹائپ رائٹر کے پیچھے سر چھپائے ہنس رہی تھی۔ میں سمجھ گیا۔ شرارت ڈمپل کی تھی۔ چنانچہ دوسرے پہر جب وہ کسی کام کے لیے باہر گئی تو میں نے اس کے سلولائیڈ کے چھوٹے سے بیگ میں ڈبہ کھول کر پھلوں کا رس انڈیل دیا۔ شام کو ڈمپل چلنے سے پہلے بیگ کھول کر اپنے دستانے نکالنے لگی تو اس کی انگلیاں لت پت ہو گئیں اور اس نے جلدی سے بیگ الٹ دیا رس میں بھیگے ہوئے دستانے، رومال، کنگھی اور پف فرش پر گر پڑا۔ ڈمپل شور مچانے لگی۔

''دیکھئے جناب۔ میری ساری چیزوں کا ستیاناس ہو گیا ہے یہ آخر کس نے شرارت کی ہے۔

میں میجر سے شکایت کروں گی۔ اب میں ان کا کیا بناؤں۔

اور میں منہ دوسری طرف کئے ہنس رہا تھا۔ حوالدار کلرک بھی ہنس رہے تھے۔ سب سے زیادہ محظوظ بوڑھا جاپانی مترجم ہوا تھا وہ لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔ ڈمپل کو پتہ چل گیا کہ شرارت میری تھی۔ چنانچہ اس نے دوسرے روز میرے ایک دستانے میں انڈے کا لعاب بھر دیا۔ لیکن میں نے برا نہ مانا۔ میں ڈمپل کی بات کا برا نہیں منانا چاہتا تھا۔ میرے لیے وہ ایک معصوم اور بے ضرر ہرنی تھی جو جنگل کے کسی کنج میں پر سکوں جھیل کے کنارے مخملیں گھاس کے نرم قالین پر کلیل کر رہی ہو۔ میں چھپ کر نیچر کے اس ازلی اور ابدی رقص کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جس کی ہر والہانہ جنبش میں زندگی، حسن اور تخلیق کی تڑپ تھی۔ یہ ذروں کا رقص تھا۔ دھرتی کا رقص تھا۔ دھرتی ناچتی ہے تو زلزلے آتے ہیں اور نئے چشمے پھوٹتے ہیں اور نئی جھیلیں نمودار ہوتی ہیں یہ زندگی کا رقص تھا اور ڈمپل اس رقص کی ایک ٹوٹتی قوس تھی۔ اس کے بال سلک کے ریشوں سے بنائے گئے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں پھوٹتی سحر کی تازگی تھی اس کے ہونٹوں پر شفق کا سونا تھا۔ اس کی چال میں، اس کے اعضا میں ایک ربط تھا، سلیقہ تھا، حسن تھا۔ حسن... جو پچھلے پہر... ادھ کھلے پھولوں پر شبنم کے آنسو بن کر چمکتا ہے اور سورج کی اولین کرن کے ساتھ خیابانوں میں جھانکتا ہے جو اس وقت بھی تھا جب ڈمپل نہیں تھی اور جو اس وقت

بھی ہوگا جب ڈمپل نہیں ہوگی۔ جو اس سے پہلے بھی تھا اور جو اس کے بعد بھی رہے گا۔ ازلی و ابدی' عظیم و غیر فانی' جاری و ساری...۔

ہمارے قریب پڑے ہوئے سماوار میں پانی کھولنے لگا اور ایک لمبی سسکار کے ساتھ ٹونٹی میں سے سفید بھاپ نکلنے لگی۔ میرا دوست خاموش ہوگیا۔ ہم نے جلدی جلدی چائے بنائی اور پیالیوں میں ڈال کر پینے لگے۔ خشک نہر میں چرتی ہوئی بکریاں باہر نکل آئی تھیں اور کنارے کنارے اگی ہوئی بھنگ کی جھاڑیوں میں منہ مار رہی تھیں۔ کھڑکی میں سے اخیر جنوری کی خنکی اندر داخل ہو رہی تھی۔ گرم کپڑوں میں ملبوس چائے پیتے ہوئے ہم اپنے تئیں تازہ دم اور بشاش محسوس کر رہے تھے۔ احسان نے جلا ہوا تمباکو جھاڑ کر پائپ میں نیا تمباکو بھرا اور اسے سلگا کر دو تین پرسکوں کش لگانے کے بعد گہری اور ملائم آواز میں بولا۔

اب ڈمپل دفتر میں داخل ہوتی تو مجھے ہر شے میں زندگی کی لہر دوڑتی محسوس ہوتی۔ وہ ریڈیو سٹیشن کے احاطے میں ہوتی اور دفتر کی ہر شے ریکارڈوں والی الماری' لمبی میزیں' ریڈیو سیٹ' ٹائپ رائٹر' پانی کی صراحی' دروازوں پر گرے ہوئے پردے' دہلیز میں بچھا ہوا فٹ پیڈ' ہر چیز ہمہ تن گوش ہو جاتی۔ ڈمپل آ رہی ہے' ڈمپل آ رہی ہے۔ ڈمپل دروازے پر نمودار ہوتی اور نیلے پردے جھولنے لگتے۔ بارہ چیری کی شاخیں لہرانے لگتیں اور شہتوت کے درختوں پر طوطے ٹیں ٹیں کرنے لگتے' کمرے کی ہر شے زندگی' حسن' روشنی اور حرارت سے چمک اٹھتی۔ جیسے بہار کا ریشم آنچل انہیں چھو گیا ہو۔ ڈمپل سرد اور شیریں پانی کی ندی تھی جس کا کام کنارے پر اگی ہوئی گھاس کو شادابی اور ہریاول عطا کرنا تھا۔ اس کا وجود دفتر کی بے جان فضا کے لیے تازگی' زندگی' اور مسرت کا باعث تھا۔ اب وہ مجھ سے گفتگو کرتی تو اس کے زرد چہرے پر بہار کی صبح پھوٹتی معلوم ہوتی اور مجھے محسوس ہوتا ڈمپل گلاب کی بیل ہے جس پر اوس میں بھیگے ہوئے پھول سنہری دھوپ میں مسکرا رہے ہیں۔

پہاڑیوں میں گھری ہوئی چھوٹی سی وادی ہے جس کے اوپر سے بادل ابھی سرکے ہیں اور جہاں روشنی کے فوارے اچھلنے لگے ہیں۔ لیکن یہ حیرت انگیز بات تھی کہ روشنی' مسرت اور زندگی کے اس سیلاب میں بھی ڈمپل کسی وقت مرجھا سی جاتی اور بیٹھے بیٹھے اس کا چہرہ ایک دم اتر کر زرد ہو جاتا۔ جیسے کوئی ندی خیابانوں سے اچھلتی کودتی نکلے اور یک لخت سنگلاخ اور بنجر علاقوں میں داخل ہو جائے اور اس کی ساری شوخی اور چلبلاہٹ ماند پڑ جائے۔ اس وقت جھیل کے کنارے رقص کرنے والی ہرہرنی گھڑی بھر کے لیے اپنی کلیل بھول جاتی۔ ڈمپل بدحواس سی ہو جاتی۔ ایک بار میں نے اسے کریدنا چاہا مگر وہ مسکرانے لگی اور اس کے رخساروں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے اور مجھے محسوس ہوا ڈمپل ایک سدا بہار پھول ہے۔ وہ کبھی اداس نہیں ہو سکتی۔ اسے کوئی غم نہیں چھو سکتا۔

میرا خیال تھا ہمارے ہاں چالیس کے بعد آدمی سالگرہ مناتے ہوئے گھبراتا ہے کیونکہ اس کے بعد ہر نیا سال ایک بیمار مہمان کا

روپ دھار لیتا ہے جس کا کام صرف گھر میں چارپائی پر لیٹے لیٹے کھانستے رہنا ہوتا ہے مگر بن غازی نے دفتر کے سارے عملے کو اپنے ہاں دعوت دے ڈالی۔

اس روز آسمان پر بھورے بادل جمع ہو رہے تھے اور ہوا بند ہو گئی تھی۔ میں اور ڈمپل بن غازی کے ہاں پہنچے تو دیکھا بڑا کمرہ مہمانوں سے پر تھا اور میجر بن غازی انہیں پرانے برتن' بے ڈھنگی تصویریں' پھولدار پیالے اور سیپ کے ٹوٹے ہوئے دستوں والی کند چھریاں دکھا رہا تھا۔

یہ پیالہ میرے دادو کو شو کے جزیرے میں ملا تھا۔ انہوں نے یہاں پانچ سال تک خاک چھانی ہے حضرات"

میں اور ڈمپل کھڑکی کے قریب بیٹھ کر چائے وغیرہ پینے لگے۔ بن غازی نے دور ہی سے ڈمپل کو اور مجھے مسکرا کر سلام کیا۔ پھر اس نے ہتھیلیاں رگڑ کر چالاک مجمع گیروں کی طرح شو کا بھدا سا بت اٹھا لیا۔

ڈمپل نے کہا۔

یہ بت بن غازی نے ٹوکیو کی نمائش میں خریدا تھا۔

تمہیں کیسے پتہ چلا۔

ڈمپل مسکرا کر بولی۔

مجھے اس کی ہاؤس گرل نے بتایا ہے۔

میجر بن غازی کہہ رہا تھا۔

حضرات' شو جی کا یہ بت کپل دستو کے راجہ مہاراج سدودھن کے محلات کی زینت تھا۔ وہاں سے مہاتما بدھ اسے ٹیکسلا لے گیا۔ پچھلے سال جب ٹیکسلا کی کھدائی ہوئی تو اس بندے نے اسے ڈیڑھ لاکھ ین میں خرید لیا۔ حضرات اپنے اپنے شوق کی بات ہے۔

مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی اپنے اردگرد چھڑی سے دائرہ بنا کر کہے گا۔

"حضرات ایک ایک قدم اور پیچھے ہٹ جائیں اور ایک بار زور سے تالی بجائیں۔"

دعوت ختم ہوئی اور مہمان چلے گئے تو بن غازی مجھے اور ڈمپل کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ قالین پر بیٹھتے ہوئے اس نے کشمیری شال اوڑھی' سر پر اونی کنٹوپ پہنا اور تسبیح پھیرتے ہوئے بولا۔

میاں میں تو فقیر آدمی ہوں۔ یہ سالگرہ کا ٹنٹا تو محض یار دوستوں کی خاطر مدارت کے لیے تھا۔

اس کے بعد نرم آواز میں بولا۔

"ساڑھے تین سو روپے اٹھے ہیں اس دعوت پر۔۔۔۔"

تم ایسا کرنا دو اشرٹین منٹ بل بنا کر ہیڈ کوارٹر بھجوا دینا اور یاد رہے تاریخ ڈیڑھ دو ہفتہ چھوڑ کر ڈالنا۔

میں ہکا بکا رہ گیا۔ جب ہم اٹھنے لگے۔ تو اس نے ڈمپل کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہنستے ہوئے آنکھیں بند کر کے جھومنے لگا۔

ہم باہر نکلے تو ہلکی ہلکی برف گر رہی تھی۔ لوگ خاموشی سے آ جا رہے تھے اور ان کے سروں اور کندھوں سے برف چمٹ رہی تھی۔

میں نے ڈمپل کے انکار کے باوجود اپنا لمبا کوٹ اسے اوڑھا دیا اور فٹ پاتھ پر درختوں کے نیچے سے ہوتے ہوئے چل پڑے۔ ہوا بند تھی اور برف گرنے کے باعث سردی کم ہو گئی تھی۔ ہم پر صنوبر کے درختوں کا سایہ تھا۔ ڈمپل کے سنہری بالوں میں کہیں برف کی سپید پتیاں پھولوں کی مانند سج رہی تھیں۔ میرا سگریٹ گیلا ہو کر بجھ گیا تھا۔ میں نے اسے فٹ پاتھ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"تمہارا میجر بن غازی کے متعلق کیا خیال ہے شی زو؟"

"اور جناب۔۔۔ مجھے اس سے بڑا ڈر لگتا ہے جب وہ میرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگتا ہے تو میں کانپنے لگتی ہوں"

اور مجھ سے؟

ڈمپل مسکرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

بولو شی زو مجھ سے ڈر نہیں لگتا تمہیں۔

"نہیں" اور اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"شی زو! مجھے تمہارے گالوں کے یہ ننھے ننھے گڑھے بہت پسند ہیں۔ انہیں انگریزی میں ڈمپلز کہتے ہیں۔ میں تمہیں آج سے ڈمپلز نہیں بلکہ ڈمپل کہا کروں گا۔ یہ لفظ مترنم بھی ہے۔"

شی زو دوسری طرف منہ کئے تھی اور اسی روز سے میں نے اسے ڈمپل کہنا شروع کر دیا۔

تمہیں اعتراض تو نہیں ڈمپل؟

ڈمپل نے منہ ادھر نہ کیا۔

ڈمپل! میری طرف دیکھو۔

ڈمپل نے چہرہ میری طرف کیا وہ ایکا ایکی مرجھا کر ڈوب سا گیا تھا۔ اس نے مسکرانے کی بہتیری کوشش کی مگر افسردگی کا بھاری

پردہ جو اس کے چہرے پر گر چکا تھا نہ اٹھ سکا۔ اس کا گھر قریب آ گیا تھا وہ ایک جگہ رک گئی۔ اس نے بدحواسی میں دستانہ اتار کر ننھا سا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

''سایونارا''

اور وہ جلدی سے بازار میں گھوم گئی۔ میں وہاں بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ وہ قدرے جھک کر چل رہی تھی اور اس کی چال میں کوئی ربط و توازن نہ تھا۔

پھر ایک دن آیا جبکہ اولوں کے خوفناک طوفانوں کے بعد برف پورے زور سے گر رہی تھی۔ دفتر کی تمام کھڑکیاں بند تھیں اور انگیٹھیوں میں کوئلے دہک رہے تھے باہر تیز ہوا میں برف کے سپید گالے وحشیانہ رقص میں مصروف تھے۔ میں گرم کپڑے پہنے میز پر انگیٹھی کے پاس بیٹھا فرمائشی گانوں کے خطوط چھانٹ رہا تھا۔ پروگرام کا وقت ہو رہا تھا۔ میجر بن غازی گھر سے ہی نہیں نکلا تھا۔ ڈمپل شاید لائبریری میں گئی ہوئی تھی۔ میں نے لاگ بک اور ریکارڈ سنبھالے اور برآمدے میں آ گیا۔ بوتھ میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ڈمپل کو دیکھا وہ سٹوڈیو نمبر ۴ میں داخل ہو رہی تھی جو آف تھا۔ آج وہ صبح ہی سے کچھ چپ چاپ تھی۔ میں نے اسے بلانا چاہا مگر پروگرام میں کچھ سیکنڈ باقی رہ گئے تھے۔ بیس منٹ بعد جب پروگرام ختم ہوا تو میں سٹوڈیو نمبر ۴ کی جانب بڑھا۔ مجھے یقین تھا ڈمپل اندر ہی ہو گی۔ میں نے آہستہ سے پہلے دروازہ کھول کر شیشے کے چوکھٹے میں سے اندر نظر ڈالی۔ ڈمپل کونے والے پیانو پر بیٹھی پردوں پر دھیرے دھیرے انگلیاں رکھ رہی تھی اٹھا رہی تھی... میں نے دوسرا دروازہ بھی کھول دیا جو بے آواز تھا۔ پیانو کے گہرے اور دلگداز سر میرے کانوں سے ٹکرائے۔ سٹوڈیو کا ماحول گرم اور پرسکون تھا اور فضا میں ارگن موسیقی کے علاوہ پیانو پر رکھے ہوئے نرگس کے پھولوں کی میٹھی میٹھی خوشبو بھی ملی ہوئی تھی۔ ڈمپل کی پیٹھ میری طرف تھی۔ اسے میرے آنے کی بالکل خبر نہ ہوئی۔ میں اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے وہیں کھڑا ہو گیا۔ جیسے وہ پیانو کو کسی شاہی کنیز کی المناک داستان محبت سنا رہی ہو اور پیانو آہیں بھر رہا ہو۔ اس وقت مجھے اپنے آپ پر الف لیلوی ماہی گیر کا گمان ہو رہا تھا جو جن کی مدد سے کسی شہزادی کی خوابگاہ میں جا پہنچا ہو۔

دفعتاً پیانو بند ہو گیا۔ اور سروں کی سوگوار بازگشت ڈوبتی چلی گئی۔ پیانو خاموش تھا۔ سر ڈوب گئے تھے اور ڈمپل نے اپنا ملائم بھورے بالوں والا سر اس کی پٹی سے لگا دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر بڑی نرمی سے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ ڈمپل کے شانے پر رکھ دیا' اس نے کانپ کر سر اٹھایا وہ رو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھی اور زرد رومال سے آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اوکایاما پارک میں ٹہلتے ہوئے ایک روشن اور چمکیلی دوپہر کو ڈمپل نے مجھے بتایا کہ وہ ایک مسلمان پنجابی کیپٹن سے اپنا دل ہار چکی

ہے جو اسے چھوڑ کر مدت ہوئی کیوشو چلا گیا ہے میں اس کیپٹن کا نام ظاہر نہیں کروں گا صرف تمہیں اتنا بتائے دیتا ہوں کہ وہ گجرات کا رہنے والا ہے۔ ڈمپل نے تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔

"اسی پارک میں جب پیڑ پودے پھل پھول سے لد جاتے ہیں تو ہم پہروں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھاس پر گھومتے رہتے اوکایاما کی بہاریں اپنے جوبن پر ہوتی تھیں اور گھاس میں بھی خوشبو ہوتی تھی اور شام کو جھیلوں کے کنارے جلنے والے لیمپ ساکن پانی میں الاؤ روشن کر دیا کرتے تھے یہ کوئی دیر کی بات نہیں احسان.... کیپٹن کو اوکایاما چھوڑے دوسرا سال جا رہا ہے لیکن اس پارک میں جھولتے ہوئے چیری کے درختوں پر وہ پھول نہ کھل سکے جن کی مہک میں ہماری محبت پروان چڑھی تھی۔ چیڑ کے نوکیلے جھومروں میں وہ ستارے پھر کبھی نمودار نہ ہوئے جو ہم دونوں کو پہلو بہ پہلو محوِ خرام دیکھ کر اپنی نقرئی پلکیں جھپکایا کرتے تھے۔ اور ان سامنے والے خانقاہوں کے چوبی کلس اس چاندنی سے ابھی تک محروم ہیں جن کی نورانی دھنک میں ہماری محبت نے پہلا سانس لیا تھا۔ وہ میٹھی بولیوں والے خوش رنگ پرندے بھی اب یہاں نہیں۔ اوکایاما میں وہ برف اب بھی نہیں گری جو کیپٹن کے گھونگریالے بالوں پر سپید پتیوں کی طرح چمٹ جاتی تھی۔ بن غازی کی سالگرہ والے دن مجھے تمہارے بالوں پر رکی ہوئی برف دیکھ کر کیپٹن کا خیال آ گیا تھا اور میں اداس ہو گئی تھی.... احسان! مجھ پر تمہارے بہت احسان ہیں۔ ان کا بدلہ چکانے کے لیے ساری عمر درکار ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔ تم مجھے چاہتے ہو۔ یہی وجہ بھی کبھی میرے غمزدہ ہو جانے کی ہے۔ میں تمہیں ناامید ہوتے نہیں دیکھ سکتی اور تمہیں اپنی محبت بھی نہیں دے سکتی۔ میری تجوری بالکل خالی ہے۔ میں اپنا سب کچھ لٹا چکی ہوں.... میں تمہیں بے حد پسند کرتی ہوں اور اسی طرح پیار کرنا چاہتی ہوں جس طرح کیپٹن سے کرتی تھی مگر میری خواہش کے باوجود میں ایسا نہیں کر سکتی تم مجھے معاف کر دینا احسان..."

ڈمپل بولے جا رہی تھی۔ اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے الفاظ بے جان' مردہ اور سوکھے پتوں کی طرح گر رہے تھے۔ ہم ایک تنگ سی روش پر جا رہے تھے۔ ہمارے سروں پر صنوبر کے درختوں کا سایہ تھا۔ یہاں چھاؤں میں کافی خنکی تھی۔ ڈمپل نے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ اس کے سنہری بال پریشان سے تھے۔ چہرے پر سنگین زردی کندہ تھی۔ اس روش کے آخر پر ایک چھوٹی سی ویران جھیل تھی جس کے کنارے کیچڑ میں کنول کے زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ ڈمپل مجھے ایک درخت کے پاس لے گئی جس کے تنے کو چوڑے پتوں والی بیل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے ایک جگہ سے پتوں کو ہٹایا تو تنے پر دو دل کھدے ہوئے تھے جن میں ایک تیر پیوست تھا۔ نیچے ڈمپل اور اس کے محبوب کیپٹن کا نام لکھا ہوا تھا۔ ڈمپل کا سارا جسم کانپتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ جھیل کی طرف مڑی اور شکستہ لہجے میں بولی۔

''یہاں ہم دیر تک بیٹھا کرتے تھے۔ اس کنج کی پر سکوں تنہائی ہم پر جادو سا کر دیا کرتی تھی۔ یہاں کیپٹن نے مجھے پہلی بار آغوش میں لے کر میرا سر...''

ڈمپل نے رک کر ننھا سا زرد رومال نکالا' وہ آنسو پونچھنے لگی۔ میں ابھی تک خاموش اور ٹوٹے ہوئے دل سے اس جاپانی لڑکی کی گم شدہ محبت کی داستان سن رہا تھا۔ مجھے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ ڈمپل کسی اور کی محبت میں اتنی شدت سے گرفتار ہے۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا اور اس کیپٹن پر بے حد غصہ... جو اسے اتنی دور تک ساتھ لا کر اچانک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں نے جلدی سے ڈمپل کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

''جی نہ ہارو ڈمپل! محبت ہمیشہ ناکام رہتی ہے اور دنیا اس سے بڑھ کر ہمیں کوئی شے دی بھی نہیں سکتی۔''

ڈمپل میری چھاتی سے سر لگائے سسکیاں بھرنے لگی۔ پارک سے نکل کر میں پہلی مرتبہ ڈمپل کو اس کے گھر تک چھوڑنے گیا۔ ان کا گھر شہر کے گنجان ترین حصے میں تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں کئی پر پیچ بازاروں اور تنگ گلیوں میں سے گزرنا پڑا۔ بے ڈھنگے بازاروں میں جھکی ہوئی چھتوں والے چائے خانوں کے اندر سوجے ہوئے چہروں والے زرد رو جاپانی مٹیالی چائے پی رہے تھے۔ رکشا چلانے والے بجلی کے کھمبوں سے ٹیک لگائے سیاہ رنگ کا سگار پی رہے تھے اور میلے دانت نکال نکال کر اپنے ساتھیوں سے گپ شپ میں مشغول تھے۔ گندی اور نمدار گلیوں میں عورتیں اپنے گھروں کے باہر کھڑی لمبے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں یا آپس میں لڑ جھگڑ رہی تھیں۔ فضا میں سوکھی مچھلیوں کی تیز بدبو بسی ہوئی تھی۔ میری وردی دیکھ کر کبھی کوئی بچہ بھاگ کر ہمارے پیچھے لپکتا اور ڈمپل اسے جھڑک دیتی۔

یہ کیا کہتے ہیں ڈمپل؟

''کچھ نہیں... چائے کے لیے بسکٹ مانگتے ہیں''

ڈمپل کا گھر دو منزل تھا جس کا چھجا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ ہمیں ایک تنگ سیڑھی پر سے گزرنا پڑا جو لکڑی کی تھی۔ دوسری منزل ایک لمبا سا کمرہ تھا جسے تین چار چھوٹے چھوٹے کمروں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ ہر کمرے کو پھولدار کاغذ کی قد آدم دیوار الگ کرتی تھی۔ دروازے پر ڈمپل کا بوڑھا دادا ملا جس کے چہرے کی زرد کھال جھریوں سے لٹک رہی تھی۔ اس کا روئی دار کوٹ کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ اس نے ایک فوجی کو اپنے گھر میں دیکھا اور گھبرا کر سجدے میں گر پڑا۔ ڈمپل کے کمرے میں بھی فرش پر رنگ دار چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف کمبل میں لپٹا ہوا بستر پڑا تھا۔ کونے میں اونچی چوکی پر گوتم بدھ کی چھوٹی سی مورتی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ ہی میز پر لکھنے

پڑھنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ڈمپل نے مجھے کرسی پر بٹھلایا اور خود چٹائی پر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں یہ گھر پسند آیا؟"

ہاں ڈمپل یہ بالکل ہمارے گھروں کی مانند ہے"

میں اسی گھر میں پیدا ہوئی تھی۔

ڈمپل کی ادھیڑ عمر ماں اندر آ گئی۔اس نے جھک کر سلام کیا۔اور دو زانو ہو کر چٹائی پر بیٹھ گئی۔اس کے بعد ڈمپل کی چھوٹی بہن می ہو اندر آئی۔جس کی عمر دس گیارہ سال کے لگ بھگ ہو گی۔اس کے گول گول چہرے سے شرارت ٹپک رہی تھی۔می ہو دونوں مٹھیاں جوڑ کر جھکی اور شرما کر باہر بھاگ گئی۔ڈمپل نے اسے آواز دی۔

او جالدا سائی می ہو۔

اس جملے میں چائے کے لفظ نے سارا بھید کھول دیا۔

ڈمپل چائے مت منگوانا۔

لیکن تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی اور ساتھ ہی پائن ایپل کے کتلے بھی۔واپسی پر ڈمپل' اس کی ماں اور چھوٹی بہن مجھے گلی تک چھوڑنے آئے۔ڈمپل بازار تک ساتھ دینے کو تیار تھی لیکن میں نے اسے روک دیا اور اکیلا ہی چل پڑا۔گلی کا موڑ گھومتے ہوئے میں نے دیکھا وہ لوگ ابھی تک مکان کے باہر کھڑے تھے۔

اس رات بستر پر لیٹتے ہی مجھے ڈمپل کے خیال نے گھیر لیا۔میں جانتا تھا ڈمپل کسی اور کی ہو چکی ہے اور وہ ایک ایسا چشمہ ہے جہاں میری پیاس کبھی نہیں بجھ سکتی۔لیکن اس کے باوجود میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس چشمے کے کنارے آن بیٹھا۔میں نے پوری قوت سے اس سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی۔اور اب کنارے تک پہنچنے کی تمنا دل میں باقی نہ تھی۔میں نے من ہی من میں فیصلہ کر لیا کہ ڈمپل کے دل سے اس شخص کا خیال نکال کے رہوں گا جو اسے دھوکا دے کر چلا گیا ہے اور جو پھر کبھی اس کے پاس نہ آئے گا۔چنانچہ میں پہلے سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھنے لگا۔تیسرے چوتھے روز میں ہاؤس بوائے کے ہاتھ چینی' جام' مکھن' پنیر' پھل' بسکٹ اور چائے وغیرہ ڈمپل کے ہاں بھجوا دیتا۔کسی روز اس کی چھوٹی بہن می ہو آن نکلتی تو میں اس کی جیبیں چاکلیٹ سے بھر دیتا۔میجر بن غازی اپنے کمرے میں بیٹھا اس کھیل کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا وہ براہ راست مجھے کہنے سے قاصر تھا۔لیکن در پردہ چوٹ کرنے سے کبھی نہ چوکتا تھا۔

ارے میاں! جب خدا سے لو لگائی ہو تو دل کا دریچہ کھلا ہوتا ہے اور جب کسی فیشن ایبل سے پالا پڑا ہو تو بس جیب کا صفایا ہو جاتا ہے۔"

لیکن مجھے اس کی ذرہ برابر بھی پروانہ تھی۔ مجھے کسی کی بھی پروانہ تھی۔ میں ڈمپل کی محبت کا بھوکا تھا۔ میں اس کے پیار بھرے بول اور مترنم آواز کا شیدائی تھا۔ مجھے بن غازی کی مکارسوں سوں اور عیار فنی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ محبت کے برق رفتار پر لگا کر میری پرواز ان خیابانوں میں تھی جن کی چراگاہیں جنگلی پھولوں سے مہکی ہوئی تھیں۔ ڈمپل کی محبت نے میرے لیے ان خانقاہوں کے دریچے کھول دیے تھے جن کے مقدس آستانوں پر لوبان کی دھیمی جوت' محبت میں زخم خوردہ شہزادیوں کی روحیں نوحہ کناں تھیں۔ یہ ایک آگ تھی جس کے شعلے میری روح کو جلا بخش رہے تھے۔ ایک آتشیں راگ تھا' جس کی لہریں مجھے ان دیکھے خوابگوں جزیروں کی طرف بہائے لیے جا رہی تھیں' ایک خیال تھا۔ عظمت' بزرگی اور سربلندی کا خیال' روشنی و وسعت اور ہمہ گیر ہمدردی کا خیال۔ جس کی سر بفلک چوٹیوں پر مجھے اپنا آپ نورانی خلاؤں میں لطیف ابر پاروں میں ڈھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ عظمت میں نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ یہ راگ میں نے کبھی نہ سنا تھا اور اس آگ کی چمک میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ڈمپل کے باریک ہونٹ پہلے کبھی اتنے خوبصورت نہ تھے۔ اس کے بالوں میں شفق کا سونا اس آب و تاب سے پہلے کبھی نہ پگھلا تھا اور اس کی آواز پر اس سے پیشتر کبھی معبدوں کی گھنٹیوں کا شبہ نہ ہوا تھا۔ اوکایاما پارک میں ڈمپل کو بے اختیار اپنے ساتھ لگا لینے کے بعد میں نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ جب چیری کے پھول نیلگوں دھوپ میں شاخ در شاخ کھلے ہوں تو پرندے اپنے آشیانوں میں کیوں نہیں ٹھہرتے۔ یہی وہ مدہوش اور بے خود لمحات تھے جب محبت چور دروازے سے میرے دل میں دبے پاؤں داخل ہوئی تھی اور مجھے بالکل خبر نہ ہوئی تھی۔ اب وہ میرے خون کے ہر ذرے میں سرایت کر گئی تھی اور میں جیسے خواب میں اس کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

میری محبت وقت کے ساتھ پھل پھول رہی تھی۔ یہ گاڑی ایک جچی تلی رفتار کے ساتھ چھوٹے چھوٹے پڑاؤ چھوڑتی بڑے جنکشن کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اچانک کسی نے زنجیر کھینچ دی۔ ایک دھچکا سا لگا اور گاڑی کے پہیے اپنے آپ لائن پر جم گئے۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ڈمپل برآمدے میں تیز قدم اٹھاتی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے کندھوں اور سر پر کہیں کہیں برف کی پتیاں رکی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں میں والہانہ چمک تھی۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور جھول سی گئی۔

"وہ... وہ آ رہا ہے احسان۔"

"کون آ رہا ہے"

''اس کا خط آیا ہے.... وہ.... آج شام اوکایاما پہنچ رہا ہے۔''

''آخر اس کا نام بھی لو۔''

''کیپٹن....''

ڈمپل نے جلدی سے کہا اور دستانے اتارتے ہوئے اندر بھاگ گئی۔

برآمدے کی بند کھڑکیوں کے شیشوں میں سے باہر برف گرتی صاف نظر آ رہی تھی۔ برف صبح سی گر رہی تھی اور شہتوت' چیری اور صنوبر کی بے برگ ٹہنیوں' بجلی کے تاروں' باغ کے بنچوں اور خزاں نصیب گھاس کو سپید' سرد اور بے جان کفن پہنا رہی تھی۔ ہر شے' ہر چیز پر ایک سنگین خاموشی' ایک مرگ آلود سکوت طاری تھا۔ میں برآمدے میں کھڑکی سے لگا برف پوش مرقدوں کو دیکھتا رہا اور ڈمپل ہفتہ بھر کا پروگرام ٹائپ کرتی رہی۔ ٹک ٹک ٹک.... مشین پر اس کی انگلیاں چلتی رہیں اور میرے ذہن پر بے ربط اور بے رنگ لفظوں کی بے معنی قطاریں ابھرتی گئیں۔ ٹک ٹک ٹک اور وہ پھول ایک ایک کر کے شاخساروں سے ٹوٹتے رہے جنہیں میں نے چاندی کے خیابانوں میں دیکھا تھا۔ مشین چلتی رہی' لفظ بگڑتے گئے' پھول مردہ پرندوں کی طرح گرتے گئے اور سنہری اور مقدس تحریریں سیاہ دھبوں میں سمٹ آئیں اور ٹنڈ منڈ برف آلود درخت اجڑے مرقدوں کے ویران کتبوں میں بدل گئے اور مجھے اس غریب جاپانی دختر دہقاں کا گیت یاد آ گیا جس کی راہ میں غربت اور سردی کی سنگین دیوار حائل تھی اور جس نے برف پوش گھاٹیوں کو دیکھ کر کہا تھا۔

''میرے پاس جوتا نہیں''

میرے کوٹ کی روئی باہر نکل آئی ہے اور برف پڑ رہی ہے اور راستے چھپ گئے ہیں میں تیرے مکان تک کیسے پہنچوں میرے محبوب؟

ڈمپل کا سویٹر بھی کہنیوں سے ادھڑ چلا تھا۔ برف پڑ رہی تھی اور اسے آج اپنے محبوب سے ملنے جانا تھا اور راستے برف سے ڈھک گئے تھے۔ میں جلدی جلدی ریڈیو سٹیشن سے باہر نکل آیا۔ گرتی برف میں سڑکیں ویران تھیں اور چند گزوں کے فاصلے پر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ چائنا مارکیٹ میں کافی رونق تھی۔ دوکان میں بتیاں روشن تھیں اور لوگ دہکتے ہوئے ہیٹروں کے گرد کھڑے خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ ایک دوکان پر مجھے ہلکے نیلے رنگ کا سویٹر بہت پسند آیا جس کے بائیں طرف چیری کا درخت بنا تھا۔ یہ سویٹر میں نے خرید لیا اور لفافے میں ڈال کر واپس دفتر آ گیا۔

شام کو ڈمپل چلنے لگی تو میں حسب معمول اسے ٹرک تک چھوڑنے آیا۔ ٹرک چلنے لگا تو میں نے لفافہ اس کی جھولی میں ڈال دیا۔

اس نے جلدی سے لفافہ کھولا اور ہلکے نیلے رنگ کا سویٹر دیکھ کر اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپائے وہ کچھ کہنے والی تھی کہ ٹرک روانہ ہو پڑا۔

اسی شام اسے اپنے پردیسی محبوب سے ملنا تھا۔ میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔

دوسرے دن ڈمپل دفتر آئی تو اس کا چہرہ نرگس کے باسی پھول کی طرح کملایا ہوا تھا اور سوجی ہوئی آنکھوں میں ویرانی طاری تھی۔ جیسے وہ رات بھر روتی رہی ہو۔ میں دم بخود سا رہ گیا۔

''کیا بات ہے ڈمپل؟''

میں آگے بڑھا۔ ڈمپل رک گئی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر مجھے افسردگی سے دیکھا اور دیوانوں کی طرح مجھ سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دفتر میں ابھی کوئی نہیں آیا تھا پھر بھی میں اسے سنبھالا دیتے ہوئے خالی سٹوڈیو میں لے آیا۔ یہاں بیٹھ کر وہ جی بھر کر روئی۔ جب دل کا غبار ہلکا ہوا اس نے آنسو پونچھے۔ بال درست کئے اور الف سے لے کر ی تک ساری روئداد سنائی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ شام کو نیا سویٹر پہن کر کیپٹن سے ملنے گئی وہ اسے دیکھ کر بہت مسرور ہوا۔ اس نے اس کے نئے سویٹر کی بہت تعریف کی۔ اس نے ڈمپل کے سنہری بالوں کو چوما۔ اس کی گلابی پتیوں پر لب رکھے۔ اور ڈمپل کے جسم کا ہر ذرہ دل کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کیپٹن کا ایک دوست آ گیا۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ انہوں نے مل کر چائے پی اور پھل کھائے۔ ڈمپل بے حد خوش تھی۔ آتش دان میں کوئلے دہک رہے تھے۔ فرش پر بہترین سرخ رنگ کے قالین بچھے ہوئے تھے۔ کمرہ پرسکون اور گرم تھا۔ کیپٹن باتیں کر رہا تھا اور ڈمپل کے ذہن میں پائلیں جھنک رہی تھیں۔ وہ سورج مکھی کے پھول کی مانند اپنے محبوب کو مسحور ہو کر تک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کا ڈاکٹر دوست اٹھ کر باہر چلا گیا۔ وہ دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ مثبت اور منفی ایک جگہ تنہا چھوڑ دیئے گئے۔ کیپٹن نے سگریٹ بجھایا اور ڈمپل کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈمپل کو بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ڈمپل کانپنے لگی۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے محبوب کو دیکھا جس کی شکل ایک دم بدل گئی تھی' جس کی پیار بھری آنکھوں میں وحشت اور درندگی جھلک رہی تھی' جس کا چہرہ تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ کیپٹن کے بازوؤں کی گرفت آہنی ہو رہی تھی اور ڈمپل کا حلق سوکھ رہا تھا۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''کیپٹن ... میں مر جاؤں گی'' مگر کیپٹن..... کمرے سے جا چکا تھا اور وہاں صدیوں پہلے کا ننگ دھڑنگ وحشی انسان کھڑا نیزہ تانے اپنے شکار پر جھپٹ رہا تھا۔ ڈمپل کی آواز ڈوب گئی اور وہ اس جنگلی شکاری کے بازوؤں میں مردہ ہرنی کی طرح لٹک گئی۔

جب اسے ہوش آیا تو کیپٹن جا چکا تھا اور وہ قالین پر پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر اس میں اٹھنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔

دروازہ آہستہ سے کھلا اور اسے کیپٹن کا ڈاکٹر دوست اندر آتا دکھائی دیا۔ اس کی پتلون اس کے کندھے پر تھی اور قدم ڈول رہے تھے۔ یہ وہ ڈاکٹر تھا جو چند لمحے قبل اقبال کے فلسفہ خودی پر لیکچر پلا رہا تھا۔ ڈمپل نے اٹھ کر بھاگ جانا چاہا مگر اس کی ٹانگیں جیسے اس کے جسم سے علیحدہ ہوگئی تھیں۔ اس نے چیخنا چاہا مگر اس کا منہ بند کر دیا گیا۔ ڈمپل نے مجھے بتایا کہ اب اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا۔ جس مینار پر وہ چڑھ رہی تھی اس کی ساتویں منزل سے وہ سر کے بل نیچے سرکنڈوں میں آ گری ہے۔ وہ معبد جس کے اندر آج تک کسی نے قدم نہ رکھا تھا اب ایک کارواں سرائے میں بدل چکا تھا۔ جس کے صحن میں ڈھور ڈنگر جگالی کر رہے تھے.... ڈمپل کے آنسو خشک تھے مگر وہ رو رہی تھی۔ اس کے شانے کانپ رہے تھے۔ میرے ذہن میں چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے لڑائی میں ان گنت لوگوں کو ان گنت کپتانوں اور میجروں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور میرے لیے ایک اور کیپٹن کی کھوپڑی اڑا دینا کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ ریوالور جیب میں ڈالے میں دو دن اس کیپٹن کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ مگر وہ نہ مل سکا۔ وہ اسی دن صبح اوکاڑا چھوڑ چکا تھا۔

دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں گم ہوتے گئے۔ وقت کا کارواں اپنی منزلوں پر منزلیں عبور کرتا آگے بڑھتا گیا اور ڈمپل ہر منزل، ہر پڑاؤ پر اپنی رہی سہی پونجی دونوں ہاتھوں سے لٹاتی چلی گئی۔ اس کا گلا خراب ہوگیا تھا اور وہ کھانسنے لگی تھی۔ اس کا بدن پیلا پڑ رہا تھا اور اس کی آنکھیں اندر کو دھنس رہی تھیں اور وہ دفتر سے اکثر غیر حاضر رہنے لگی تھی۔

ایک دن ہم دفتر کے عقب والی خاموش سڑک پر تنہا جا رہے تھے۔ یہ خزاں کے دن تھے سڑک خشک پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور کہیں کہیں خشک سرکنڈے اور مردہ پتوں کے ڈھیر سلگ رہے تھے۔ ڈمپل نے ہلکا نیلا سویٹر پہن رکھا تھا اور ہاتھوں میں سفید دستانے تھے۔ وہ آج قدرے ہشاش بشاش تھی۔ میں نے کہا۔

"ڈمپل مجھ سے شادی کر لو"

ڈمپل رک گئی۔ اس نے یوں میری طرف دیکھا جیسے مجھے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔

"احسان.... میں دنیا کے ہر آدمی سے شادی کر سکتی ہوں مگر تجھ سے کبھی نہیں، کبھی نہیں۔"

"کیوں ڈمپل؟"

اس لیے کہ تم بڑے اچھے ہو۔

یہ تو اور بھی اچھا ہے۔

نہیں یہ بہت برا ہے.... کاش تم اتنے اچھے نہ ہوتے۔ میں تمہیں پسند کرتی ہوں اور تم سے زندگی کے کسی بھی دور میں بد دیانتی نہیں کرسکتی۔

''تم کیسی باتیں کر رہی ہو ڈمپل''

یہ مردہ ڈمپل کی باتیں ہیں احسان۔ بیمار ڈمپل کی باتیں۔

بیمار.....

ہاں بیمار.... میں بیمار ہوں' میں ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہوں۔ میرے گلے کی نالی اندر ہی اندر گل رہی ہے۔ یہ روگ مجھے ان گیارہ عاشقوں میں سے ایک نے عطا کیا ہے جو میرے رنگ و روپ پر فدا تھے اور جو مجھے سکول کے دنوں میں مسلسل خطوط لکھا کرتے تھے لیکن جنہیں میں نے کبھی جواب نہیں دیا تھا۔ آج وہ میرے چہیتے محبوب ہیں اور یہ مرض ایک نے مجھے دیا اور میں نے ایک ایک کر کے سب کو دے دیا ہے۔ یہ روگ میرے خون میں رچ گیا ہے۔ اور یہ ہر اس آدمی کی امانت ہے جو مجھے چائے پلا کر درندوں کی طرح اپنے بازوؤں میں جکڑ لیتا ہے۔ تم تو بے ضرر ہو۔

میں مبہوت سا ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔

ڈمپل ڈمپل.... میں تمہارا علاج کراؤں گا ڈمپل۔ تمہیں ہسپتال میں داخل ہونا ہوگا۔ تمہیں ابھی نہیں مرنا ڈمپل! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔

ہم ایک جگہ چیڑ کے سایوں میں کھڑے تھے۔ خزاں نصیب ہوا جھومروں میں آہیں بھر رہی تھی۔ ڈمپل کے ہونٹوں پر زہر بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ہاں احسان.... مجھے ابھی نہیں مرنا۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ اٹھارہ سال بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ میں نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے؟ لیکن زندگی تو مجھ سے روٹھ کر بہت پیچھے رہ گئی ہے' اتنی پیچھے کہ اگر اسے ڈھونڈنے بھی نکلوں تو نہ پاسکوں۔ جاپانی لڑکی سب کچھ برداشت کرسکتی ہے مگر اپنی محبت کی توہین نہیں سہہ سکتی۔ میں زندگی کی تاریک منڈیر پر کھڑی ہوں' نیچے موت کی تاریک کھائی ہے۔ میں نے کیپٹن سے محبت کی' اس نے میری محبت کو پاؤں تلے مسل دیا۔ میں اب بھی اسے چاہتی ہوں مگر زندگی اپنا توازن کھو بیٹھی ہے اور میں چٹیل ڈھلانوں سے موت کی کھائیوں میں لڑھک رہی ہوں۔ ہسپتال مجھے میری زندگی واپس نہ دلا سکے گا۔ اور اب اگر کیپٹن .... بھی چاہے۔ تو مجھے دوبارہ اس جگہ پر کھڑا نہیں کرسکتا جہاں سے اس نے مجھے دھکا دے کر لڑھکا دیا تھا۔

ڈمپل چپ ہوگئی۔ اس کی شکست خوردہ زخمی آواز ٹوٹ گئی اور ہم خشک پتوں پر بوجھل قدم اٹھاتے ہوئے واپس چل پڑے۔

۱۵ اگست کو ہندوستان دو آزاد مملکتوں میں تقسیم ہوگیا۔ اوکایاما میں مقیم ہندوستانی اور پاکستانی فوجیوں نے جی بھر کر خوشیاں منائیں۔ شام کو میں چند ایک دوستوں کے ہمراہ شہر کے خوبصورت ترین ہوٹل میں جا نکلا۔ ہال کمرہ چھوٹی چھوٹی میزوں اور کرسیوں سے لبریز تھا۔ ہندوستانی' پاکستانی اور کئی ایک غیر ملکی فوجی لوگ بیٹھے شراب اور کھانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فضا میں لوگوں کی باتوں اور قہقہوں کا شور گلاسوں اور چمچوں کے شور سے مخلوط ہو رہا تھا۔ ہم ایک خالی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ اچانک مجھے ڈمپل نظر آئی اور میری نظریں وہیں رک گئیں۔ وہ کونے میں ایک طرف ریشمی پردے کی جھالر کے نیچے' بڑے پیانو کے ساتھ والی میز پر بیٹھی تھی۔ اس روز وہ جاپانی لباس کمینو میں ملبوس تھی جس پر گلابی اور قرمزی رنگ کے بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ امریکی ایم پی کا سارجنٹ بیٹھا سینڈوچ کھا رہا تھا۔ ڈمپل اس کے گلاس میں شیمپین انڈیل رہی تھی اور امریکی سارجنٹ سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ میں اٹھا اور لوگوں کے درمیان سے ہوتا ہوا ڈمپل کی میز کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''ڈمپل؟''

ڈمپل نے مجھے دیکھا اور سراسیمہ سی ہوگئی۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے اٹھی اور مجھے ایک طرف لے گئی۔ امریکی سارجنٹ اس بچے کی طرح مجھے تکنے لگا جس کا کھلونا کسی نے اٹھا لیا ہو۔

ڈمپل میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹ سرخی سے تپے ہوئے تھے اور زرد گالوں پر ملگجی غازے کا غبار اٹھ رہا تھا۔ کمینو میں وہ ایک آسمانی حور دکھائی دے رہی تھی جو اڑنے کے لیے پر تول رہی ہو۔

''ڈمپل تمہیں کیا ہوگیا ہے؟'' ڈمپل مسکرا رہی تھی۔

''ڈمپل تم نے شراب کب سے شروع کی؟''

ڈمپل کی آنکھوں میں شیمپین کا خمار سلگ رہا تھا اور کسی وقت وہ جھول سی جاتی تھی۔

''تھوڑی دن ہوئے۔ مگر کیا یہ بری بات ہے احسان؟ تم نہیں دیکھتے اس امریکی کیپٹن کی شکل میرے کیپٹن... سے کس قدر ملتی ہے۔ اوکایاما میں ہر سپاہی' ہر سارجنٹ' میرے کیپٹن سے مشابہ ہے.... یہ تو مجھے اب پتہ چلا..... تم یہاں کیسے؟..... ہاں تمہیں پاکستان مبارک ہو۔ آزادی مبارک ہو.....''

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر میرے ہونٹوں پر تالا پڑ گیا اور ڈمپل جلدی سے اپنی میز پر واپس چلی گئی۔

دوسرے روز ڈمپل دفتر نہ آئی۔ ڈمپل نے کوئی درخواست نہ بھیجی۔ دو ہفتے گزر گئے ڈمپل کی اطلاع نہ آئی۔ میں اس سے ناراض تھا۔ میں نے اس کے گھر جا کر حالات دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ تیسرے ہفتے ڈمپل کی چھوٹی بہن می ہو دفتر آئی۔ اس نے بتایا ڈمپل بہت بیمار ہے۔ میں نے اس کو جھڑک کر واپس کر دیا لیکن دفتر سے نکلتے ہی سیدھا ڈمپل کے ہاں پہنچا۔ وہ اپنے کمرے میں کمبل اوڑھے چٹائی پر لیٹی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ اور اس کی ماں سرہانے بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی۔ ڈمپل نے مجھے دیکھتے ہی منہ دوسری طرف کر لیا۔ مجھے دھکا سا لگا۔ میں اس پر جھک گیا۔

"ڈمپل! ڈمپل!..... میں اتنا تو برا نہیں"

اور غریب لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی بوڑھی ماں اپنے آنسو پونچھتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے نبض دیکھی بخار ہلکا تھا۔ مگر جسم پر سرخ سرخ دانے ابھر آئے تھے۔ باریک ہونٹ' جو کبھی گلاب کی پتیوں ایسے ہوا کرتے تھے' سیاہ پڑ رہے تھے۔ ڈمپل نے رومال سے گال ڈھانپ رکھا تھا۔ میرے بے حد اصرار پر اس نے رومال ہٹایا تو وہاں بدنما پھوڑا نکلا ہوا تھا۔

"ڈمپل تمہیں ہسپتال جانا ہوگا... ابھی..... اسی وقت۔"

اور میں نے ڈمپل کو اسی روز ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ کرنل بلمپ اوکایاما کے اس ہسپتال میں پندرہ سال سے کام کر رہا تھا۔ وہ میرا تھوڑا بہت واقف تھا۔ میں نے اسے ساری روداد کہہ سنائی۔ اس نے ڈمپل کے گلے کا ایکسرے لیا۔ فلم کو گھورتے ہوئے اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"نرخرہ قریباً گل چکا ہے۔ اس کا علاج بغیر آپریشن کے اور کچھ نہیں۔ لیکن اس پر کافی خرچ آئے گا اور پھر جان کا خطرہ مول لینا پڑے گا۔

میں نے کرنل بلمپ کا ہاتھ تھام لیا۔

روپے کا خیال نہ کریں۔ آپریشن ضرور کامیاب ہوگا۔

آپریشن سے قبل ایک ماہ تک ڈمپل کو زیر علاج رہنا تھا۔ میں نے اس کے لیے ایک الگ کمرہ وقف کروا لیا۔

قیام پاکستان کے بعد نوزائیدہ مملکت کو اپنے دلیر سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ یہ افواہ دو ماہ سے چکر لگا رہی تھی کہ کوئی پتہ نہیں ہمیں کب واپسی کا حکم نامہ مل جائے۔ لیکن کچھ دنوں سے یہ افواہ کچھ زیادہ ہی گرم ہو گئی تھی۔ پنجابی سپاہیوں نے اوکایاما کے بازاروں میں خرید و فروخت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ میجر بن غازی نے سٹوڈیو میں لگے ہوئے ریشمی پردوں کے لحاف اور تکیوں کے غلاف بنوا لیے تھے۔

ڈمپل کے آپریشن کا دن قریب آ رہا تھا۔ میرا زیادہ وقت ہسپتال میں گزرتا تھا۔ دفتر سے نکل کر میں صدر برگ اور شبو کے پول لیے سیدھا ڈمپل کے پاس پہنچتا اور اس کے سرہانے پھولوں کا ڈھیر لگا دیتا۔ مجھے دیکھتے ہی ڈمپل کا چہرہ تمتمانے لگتا۔ میں کرسی کھینچ کر اس کے پاس ہو بیٹھتا۔ اس کا ننھا منا پیارا ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہوتا اور میں اسے طرح طرح کی من گھڑت ہنسانے والے قصے کہانیاں سناتا رہتا۔ ڈمپل کی چھوٹی بہن می ہو پھولوں کا گلدان سجانے لگتی۔ کسی وقت میں اپنے وطن پنجاب کے دریاؤں' کھیتوں' میدانوں اور شہروں کا ذکر لے بیٹھتا۔ میں اسے بتاتا کہ اوکایاما کی مانند ہمارے شہروں کی گلیاں بھی پر اسرار اور تاریک ہیں اور کھیتوں میں جب فصل کی کٹائی کا موسم شروع ہوتا ہے تو وہاں بہت بڑا میلہ لگتا ہے اور ڈھول بجتے ہیں اور دھرتی کے بیٹے ان کی تال پر جھومر ڈالتے ہیں اور ان کے مکھن لگے چمکیلے بال ہوا میں لہراتے ہیں اور شہروں کی تنگ و تاریک دھندلی گلیوں میں مسجدوں کے دروازوں کے باہر اب بھی نوعمر لڑکیاں اپنے چھوٹے بھائیوں کو کندھے سے لگائے اس انتظار میں کھڑی رہتی ہیں کہ نمازی باہر نکلیں اور ان کے بھائیوں کو دم کریں۔ ڈمپل خاموشی سے سنتی رہتی۔ کسی وقت وہ وفور مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہتی۔

"جب میں ٹھیک ہو جاؤں گی تو تمہارے ساتھ پاکستان چلی جاؤں گی۔ میں تمہارے ساتھ قصبے کے کھیتوں اور شہروں کی پر اسرار گلیوں میں گھوما کروں گی' جہاں تمہارا گھر ہوگا اور سادہ لوگ ہوں گے ان کی آوازیں مہرباں ہوں گی اور جن کے چہرے معصوم ہوں گے۔

اور میں اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دبا کر کہتا۔

ضرور ڈمپل! تم میرے ساتھ چلنا' ہمارا قصبہ دریا کے کنارے واقع ہے اور ہمارا گھر قصبے میں سب سے بڑا ہے اور عقب میں امرودوں کا باغ ہے۔ ایک کنواں بھی ہے جس کا پانی بہت میٹھا اور بڑا ٹھنڈا ہے۔ میری ماں اور بہنیں تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔

ڈمپل کے چہرے پر خون کی سرخی جھلک اٹھتی۔ وہ آنکھیں بند کر لیتی جیسے ہمارے گھر کے پچھواڑے امرودوں کے باغ میں پہنچ گئی ہو اور قصبے کی دھندلی اور تنگ و تاریک گلیوں میں گھوم رہی ہو اور میری بہنوں کو باورچی خانے میں بیٹھی آٹا گوندھتے روٹے پکاتے دیکھ رہی ہو۔ آپریشن سے ایک روز پہلے اس کا چہرہ معمول سے زیادہ زرد اور پھیکا تھا۔ مجھے داخل ہوتے دیکھ کر وہ بچے کی طرح ہمک کر میری طرف بڑھی۔ میں نے اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہ مغموم لہجے میں بولی۔

صبح میرا آپریشن ہے' تم یہیں رہنا۔ میں بزدل نہیں ہوں مگر میرا دل جانے کیوں ڈوب رہا ہے۔ خیال کرتی ہوں کہ اگر آپریشن کامیاب نہ رہا تو؟.... نہیں احسان! میں ابھی نہیں مرنا چاہتی۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ میں ہسپتال سے نکل کر کھلے نیلے آسمان

تلے تمہارے ساتھ گھومنا چاہتی ہوں اور چیری کے گلابی پھولوں کے بارے جھکی ہوئی ٹہنیوں کو جھومتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔ابھی مجھے مرنا نہیں ہے.....

ڈمپل کیسی باتیں کرتی ہو۔تم کل بھلی چنگی ہوگی‘‘ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے تسلی دینے لگا۔ڈمپل کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کے پژمردہ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

شام کو میس (Mess) پہنچا تو پتہ چلا کہ کوچ کا حکم آ چکا ہے اور دوسرے روز دس بج کر پینتالیس منٹ پر ہم اوکایاما سے ٹوکیو روانہ ہو رہے ہیں۔میں عجب گومگو کے عالم میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔میرے دوست ضروری خرید وفروخت کے لیے بازار گئے ہوئے تھے اور کچھ ساتھی اپنے اپنے کمروں میں سامان وغیرہ بندھوا رہے تھے۔اب کیا ہوگا؟ ڈمپل کا کیا بنے گا؟ یہی سوال تھے جو میرے ذہن میں چکر لگا رہے تھے اور جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔میں یہاں رک نہ سکتا تھا۔فوج کا حکم موت کی طرح اٹل تھا۔میں نے چاہا بھاگ کر ہسپتال جاؤں اور ڈمپل کو خبر کردوں کہ میں صبح واپس اپنے وطن جا رہا ہوں اور اسے چھوڑ کر جا رہا ہوں اور پھر شاید زندگی بھر اس سے ملاقات نہ ہو سکے۔لیکن ہسپتال بند ہو چکا تھا اور ڈمپل ایک خطرناک ابتلا میں گزر رہی تھی۔نہ جانے یہ سوگوار خبر اس بدنصیب پر کیا اثر ڈالے۔میں رک گیا۔میں نے اسے فون بھی نہ کیا۔وہ رات میں نے کانٹوں پر گزاری۔

صبح صبح میجر بن غازی آیا۔ویگن میس کے لان میں کھڑی کر کے اترا اور برآمدے میں ہمیں اپنا سامان باہر نکالتے ہوئے دیکھ کر بولا۔

جوانو! تیار ہونا؟ ارے واہ! مدت بعد اپنے پاکستان کی سیر کریں گے۔

میں بند صندوق پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور اردلی کو بستر باندھتے دیکھ رہا تھا۔میجر بن غازی نے میرے قریب پہنچ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور جھک کر بولا۔

آپریشن کامیاب رہا؟

مجھے اس کا یہ فقرہ سخت ناگوار لگا۔میں نہیں چاہتا تھا کہ بن غازی ایسا آدمی ڈمپل کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھے۔

جی ہاں۔میں نے بے رخی سے اتنا کہا اور سگریٹ پھینک دیا۔بن غازی زیر لب مسکراتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔

ساڑھے دس بجے ٹرک پہنچ جائے گا۔تیار رہنا جوانو! اور وہ ویگن میں بیٹھ کر چلا گیا۔

ہسپتال پورے دس بجے کھلتا تھا۔میں ساڑھے نو بجے ہی آہنی گیٹ کے باہر پہنچ گیا۔میرے پاس رتنا کلی کے پھول اور جام اور

مکھن کے ڈبوں سے بھرا ہوا ایک لفافہ تھا۔ پھر دس بجے ہسپتال کا دروازہ کھل گیا۔ اور میں جلدی جلدی باغ کے لان اور ٹھنڈے برآمدوں سے ہوتا ہوا ڈمپل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ڈمپل کا بستر خالی تھا۔

می ہوسٹوو جلا رہی تھی۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی اور ایپرن سے ہاتھ پونچھنے لگی۔ میں نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ پھول اور لفافہ تپائی پر رکھا اور آپریشن روم کی طرف بھاگا۔ آپریشن روم کا دروازہ بند تھا۔ ایک نرس نے اندر جاتے ہوئے بتایا۔ مریضہ کو بے ہوش کیا جا چکا ہے۔ میں ہارے ہوئے جواری کی مانند بنچ پر بیٹھ گیا۔ سامنے محرابی دروازے کے وسط میں ٹنگی ہوئی گھڑی میں دس بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ میں جلدی سے اٹھا اور ڈمپل کے کمرے میں آیا۔ میں نے رتنا کلی کے پھولوں کو تپائی سے اٹھایا اور ڈمپل کے سرہانے ایک طرف بکھیر دیا۔ می ہو پلنگ کی پٹی سے لگی چپ چاپ کھڑی تھی۔

”می ہو ہم لوگ واپس جا رہے ہیں۔“

کب؟

ابھی ابھی... میں تمہیں اپنے وطن کا پتہ لکھے دیتا ہوں۔ مجھے ڈمپل کی خیریت کی اطلاع کر دینا اور... اور ڈمپل کا آپریشن ہو چکنے کے بعد اسے کہنا تمہارا نا کام احسان پاکستان واپس جاتے ہوئے تمہیں بہت یاد کر رہا تھا اور وہ اس کی ماں' اس کی بہنیں' اس کے کھیت' امرودوں کا باغ اور کنواں سب اس کا انتظار کریں گے۔“

میں نے کاغذ کے ایک پرزے پر اپنا پتہ لکھا۔ رتنا کلی کے پھولوں کو چوما۔ می ہو مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”اری پگلی! خواہ مخواہ رو رہی ہے۔ پھر کیا ہوا۔ سپاہی تو ایک نہ ایک روز چلے ہی جاتے ہیں۔“

اور میں آنسو پونچھتا ہوا تیز تیز قدموں کے ساتھ کمرے سے' برآمدوں سے باغ سے اور پھر ہسپتال سے باہر آ گیا۔ میس میں پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہمارا ٹرک لان میں آ کر ٹھہر گیا۔ ہم نے جلدی جلدی سامان رکھوایا اور واکایاما ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑے۔

لمبی گاڑی پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ سپاہیوں نے اپنے اپنے ڈبوں کو پھولدار کاغذی جھنڈیوں اور رنگ برنگے غباروں سے سجا رکھا تھا۔ لوگ دوستوں کو الوداع کہنے کافی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ امریکی اور برطانوی سپاہی کن ٹینوں پر کھڑے اپنی دوست جاپانی لڑکیوں کے ساتھ چائے پی رہے تھے اور گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ اپنا سامان اندر رکھوا کر میں سگریٹ سلگائے دروازے

کے باہر کھڑا تھا اور بے معنی نگاہوں سے لوگوں کو تک رہا تھا۔ جو بڑی گرمجوشی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ابھی گاڑی چھوٹنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں نے آر ٹی او کے دفتر سے ہسپتال فون کیا۔ وارڈ سپرنٹنڈنٹ نے می ہو کو بلایا۔

ہیلو... می ہو... آپریشن کامیاب ہو رہا ہے؟ میرا دل حلق کے قریب پہنچ کر دھڑک رہا تھا۔ می ہو کی کمزور آواز سنائی دی۔ اس نے بتایا آپریشن ابھی ختم نہیں ہوا۔ میں دونوں بازو لٹکائے دفتر سے باہر آ گیا۔ سگنل گر چکا تھا اور طعام خانوں کے دروازے کھل رہے تھے اور بند ہو رہے تھے۔ لوگوں کا شور زیادہ ہو گیا تھا۔ انجن نے پہلا وسل دیا۔

لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔ لڑکیاں اپنے پردیسی دوستوں کے اور قریب سمٹ آئیں۔

انجن دوسری بار چیخا۔

اور لڑکیوں نے اپنی باہیں اپنے دوستوں کے گلوں میں ڈال دیں اور اپنے جدا ہونے والے اور پھر کبھی نہ ملنے والے امریکی' برطانوی' ہندوستانی اور پاکستانی دوستوں سے لپٹ کر رونے لگیں۔

انجن نے تیسرے وسل کے بعد بھاپ کے پرشور بادل چھوڑے اور گاڑی پلیٹ فارم پر آگے کی طرف کھسکنے لگی۔ سپاہی ڈبے کی کھڑکیوں سے آدھے باہر نکل آئے اور خاکی رومال ہلانے لگے۔ پلیٹ فارم پر ہجوم پیچھے کی طرف سمٹ گیا اور لڑکیاں' بوڑھے' بچے جوان سبھی غمناک نگاہوں کانپتے ہاتھوں سے رنگ برنگ رومال فضا میں لہرا لہرا کر رخصت ہونے والوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ امریکی سپاہیوں نے بھرائی ہوئی آواز کی لہروں پر مشہور الوداعی نغمہ چھیڑ دیا۔

Home ...... sweet-home

ان کی آوازیں بھیگی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ گیت کے لمبے اور گہرے سر دل کو سوگوار خاموشی سے گھیر رہے تھے۔ اس خاموشی میں گھر چھوڑنے کا غم بھی تھا اور گھر میں داخل ہونے کی امنگ بھی تھی۔ پلیٹ فارم پر سناٹا سا طاری ہو گیا۔ بوڑھوں کی آنکھوں میں سے اجنبی دیس کی گلیوں کو خیر باد کہتے ہوئے غم کے آنسو رواں تھے۔ وہ امریکی تھے' وہ برطانوی تھے' ہندی تھے' پاکستانی تھے۔ سبھوں کے سینوں میں ایک مشترکہ درد چمک اٹھا تھا۔

گھر..... پیارے گھر۔

گھر کس کو پیارا نہیں..... اور پھر ہمارا گھر..... جہاں کٹائی کے دنوں میں کسان پکی ہوئی فصلوں کو دیکھ کر ڈھول کی تھاپ پر جھومر ڈالتے ہیں اور جہاں امرودوں کا باغ تھا' کنواں تھا اور جہاں ڈمپل...... وہ بدنصیب جاپانی لڑکی آنا چاہتی تھی۔

گاڑی پلیٹ فارم چھوڑتی گئی۔ لہراتے بل کھاتے' ریشمی رنگین اور بھیگے ہوئے رومال نگاہوں سے دور ہو رہے تھے' چہرے دھندلا رہے تھے... دور.... دور....۔

اوکایاما بہت پیچھے رہ گیا' ٹوکیو پیچھے رہ گیا' سنگاپور پیچھے رہ گیا' ہندوستان پیچھے رہ گیا اور ہمارا جہاز خلیج بنگال کے سیاہ پانیوں میں آن داخل ہوا۔

پاکستان میل نے مجھے دوسرے دن شام کو گوجرانوالہ پہنچا دیا۔ وہاں سے میں تانگے میں سوار ہوا اور ڈیڑھ گھنٹے میں اپنے گھر' اس قصبے میں آن پہنچا اور جب یہاں پہنچا تو زرد رنگ کا ایک میلا سا لفافہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ جس پر جا بجا ڈاکخانوں کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن میں اوکایاما کی ٹکٹ فوراً پہچان گیا۔ کانپتی ہوئی انگلیوں سے لفافہ چاک کیا۔ یہ می ہو کا خط تھا۔ ٹیڑھے میڑھے انگریزی حروف میں اس نے لکھا تھا۔

جناب!

آپریشن کامیاب رہا مگر اسی شام میری بہن مر گئی۔ وہ دن بھر بے ہوش رہی اور بے ہوشی میں اس نے کئی بار آپ کا نام لیا۔ ہم بڑے دکھی ہیں جناب۔ میری بوڑھی ماں اور دادا جان آپ کو جھک کر آداب کہتے ہیں۔ میری بہن کا کمرہ اسی طرح خالی ہے۔

می ہوکو

اتنا کہہ کر میرا دوست خاموش ہو گیا اور کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کا پائپ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بے خیالی میں جلتے ہوئے تمباکو کو انگوٹھے سے دبا رہا تھا۔

باہر آسمان ابر آلود تھا اور جنوری کی خزاں آلود ہوا چلنے لگی تھی۔ گلہ بان اپنے ریوڑوں کو لیے نہر کی پٹڑی پٹڑی گھروں کو جا رہے تھے۔